نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۲ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- ۱
جھوٹوں کے بادشاہ ---------- ۵
اے حجرہ نشینو! (نظم) ---------- سیماب اکبرآبادی ---- ۷
بھگتی تحریک کے شاعر ---------- گوری سرن لال سریواستو ایم۔اے (علیگ) ۹
عقلیت کیا ہے؟ ---------- ڈاکٹر پریم ناتھ ---------- ۱۳
ابدی طاقت (نظم) ---------- مسعود اختر جمال ---------- ۱۷
ستاروں کی پیمایش اور انکا وزن ---------- ۲۰
اعتبارات ---------- ۲۳
احسان (فسانہ) ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ---------- ۲۴
بازگشت خیال۔ آئرس (منظومات) - خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر ---- ۲۷
زار سے اسٹالین تک ---------- ۲۹
زندگی (نظم) ---------- نبی احمد بریلوی ---------- ۳۲
مکتوبات نیاز ---------- ۳۳
منظومات ---------- فضل الدین اثر۔ (پروفیسر) شور ---- ۳۷
باب الاستفسار ---------- ۳۸
مطبوعات موصولہ ---------- ۴۰

ملاحظات

جنگ کی موجودہ منزل

لڑائی کا تیسرا سال ختم ہونے کے قریب ہے اور اس دوران میں یہ آگ قریب قریب کرۂ زمین کے ہر گوشہ تک پہونچ چکی ہے، لیکن نوع انسانی ابھی تک بیم و رجا کی منزل سے نہیں گزر چکی ---

لاکھوں انسانوں کا درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون بہانا، ہزاروں میل تک جہاں کھیتیاں لہلہایا کرتی تھیں، انسان کے گرم خون کی کیچڑ کے سوا کچھ نظر نہ آنا --- بیشمار گھروں کا جلکر خاک سیاہ ہوجانا، کروروں یتیموں اور بیواؤں کا رات دن روح فرسا درد و دکھ میں تڑپتے رہنا --- ایک عالمگیر فقر و فاقہ، ایک غیر متناہی ویرانی و بربادی --- نہ بجھنے والی آگ کی لپٹوں میں انسان کی کٹی ہوئی گردنوں اور چھدے ہوئے سینوں سے اُبلتے رہنے والا خون! کچلے ہوئے سر اور سروں کے بھیجوں سے لتھڑے ہوئے چہرے --- کٹی ہوئی پسلیاں، پھٹے ہوئے شکم، ٹوٹے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں کی کھال کو پھاڑ کر نکل آنے والی ہڈیاں --- اور اسی قسم کے بہت سے ہولناک مناظر! --- یہ ہے موجودہ جنگ جو انسان کی تاریخ میں شدت و زندگی کے لحاظ سے شاید سب سے پہلی اور آخری جنگ ہے۔

جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بناکر بھیجنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے عرض کی "کیا تو اُس کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمین کو فساد و خونریزی سے بھر دے"۔ خدا نے فرمایا:- "انی اعلم مالا تعلمون" --- تمہیں نہیں معلوم، میں جانتا ہوں ---

پھر فرشتوں کی پیشین گوئی تو ہمارے سامنے ہے، لیکن خدا کیا جانتا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ علم خداوندی کے بے پردہ ہونے تک خدا کا یہ خلیفہ اب خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا

اس سے پہلے بھی لڑائیاں ہوئی ہیں اور سو سو سال تک برابر جاری رہی ہیں، لیکن ہلاکت باری کے لحاظ سے اس جنگ کا ایک ایک دن پچھلی لڑائیوں کے ایک ایک سال پر بھاری ہے اور اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس کے نقصانات کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی، لیکن اتنے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے کی پیش گوئی نہیں کر سکتے!

لڑائی اب جس منزل سے گزر رہی ہے وہ یقیناً بیم و رجا کی منزل ہے، لیکن اس منزل کو اب جلد ختم ہونا ہے، کیونکہ فریقین کی جانب سے جو انتہائی حدود، کوشش و کاوش کے متعین ہو سکتے تھے وہ سب متعین ہو چکے ہیں اور خونی سیلاب کی یہ خونی موج اب بلند ہو کر اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے، جہاں سے اس کو اب نشیب ہی کی طرف مایل ہونا ہے اور ساحل سے ٹکرائے یا نہ ٹکرائے مگر اب اس کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں!

جن جن ملکوں کو جنگ میں شریک ہونا تھا، ہو چکے ہیں اور اب کوئی حکومت ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اس کی شرکت موجودہ توازن میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے گی۔ اس لئے فریقین کی قوت و ذرایع جنگ کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے اور ہر چند لڑائی کے معاملات میں زیادہ منطق سے کام نہیں لیا جا سکتا، تاہم اسباب و علل کی دنیا میں ہمیں صغریٰ و کبریٰ دیکھ کر نتیجہ پر حکم لگانا ہی پڑتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کے بڑے حصہ پر اس وقت ناتسی اقتدار قایم ہے، لیکن محوری طاقت نام ہے صرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کے اتحاد کا، اور انھیں کو لڑائی کا سارا بوجھ اٹھانا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ، امریکہ، چین اور روس کی اجتماعی قوت ہے، اس لئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فریقین میں کس کا پلہ بھاری ہے اور اگر فیصلہ "الف بالالف" کے حساب سے ہو تو بھی نتیجہ کے متعلق دو رائیں قایم نہیں کی جا سکتیں۔

جرمنی کی انتہائی قوت اور اس کے انتہائی عروج کا زمانہ وہ تھا جب اس نے دفعتاً مغرب کی طرف سے پلٹ کر مشرق کا رُخ کیا اور تین چار مہینے کے اندر روسی فوجوں کو ماسکو اور لینن گراڈ کی چار دیواری تک ڈھکیل دیا۔ یہ وقت روس کے لئے بہت نازک تھا اور اس کی حالت ایسے قطرۂ شبنم کی سی تھی جو کانٹے کی نوک پر تھرتھرا رہا ہو، لیکن اشتراکیت کا معجزہ سمجھئے یا موسم سرما کی شدت کہ ناتسی سیلاب کا وہ زور گھٹنے لگا اور اسے بجائے حملہ کے دفاعی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔

یقیناً روس اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اس نے جرمنی کو اتنا نقصان ضرور پہونچا دیا کہ اب موسم بہار میں جو اس نے دوسرا حملہ شروع کیا ہے وہ نسبتاً بہت تھکا ہوا اور بیجان معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت خارکوف کے میدان میں بڑے معرکہ کی لڑائی ہو رہی ہے اور دونوں طرف کی آہن پوش قوتیں نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہر چند خبروں سے واقعی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جرمن فوجوں کو ابھی تک سمرچ کی طرف آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے نہ خارکوف کی طرف اور اگر روس اس موسم بہار میں ایسی ہی کامیاب مدافعت کرتا رہا تو پھر جرمنی کے خلاف پانسہ پلٹنا بالکل یقینی ہے۔

ہٹلر کو جو ناکامی روس کے محاذ پر ہوئی ہے، اور اس کا جتنا گہرا اثر ہٹلر پر ہوا اس کا پتہ خود ہٹلر کے بیانات سے چلتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ روس کے خارزار سے اپنے دامن کو کیونکر علیحدہ کرے۔ اور جرمن آبادی کو وہ کس طرح اطمینان دلائے کہ اس کی زبردست قربانیاں رائگاں جانے والی نہیں ہیں۔

اس دوران میں اس کو ایک سیاسی کامیابی فرانس میں ضرور ہوئی اور وہ یہ کہ وہاں لاوال برسر اقتدار ہو گیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسولینی نے جن شرائط پر آیندہ مدد کا وعدہ کیا ہے وہ ہٹلر کو وشی حکومت کے اس انقلاب سے بھی فایدہ نہ اٹھانے دیں گی۔ اٹلی کا ایسے وقت میں وشی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ کارسکا وغیرہ اس کے حوالے کر دئے جائیں، کبھی ہٹلر کو پسند نہیں آ سکتا اور اگر یہ سب کچھ ہٹلر کے اشارہ سے ہوا ہے اور اس کا مقصود وشی حکومت پر دباؤ ڈالکر کام نکالنا ہے، تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لاوال فرانس کی آبادی کو یہ زہر کا گھونٹ کس طرح آسانی سے پلا سکے گا، تاہم وشی حکومت سے اندرونی طور پر ہٹلر کی کوئی مفاہمت ضرور ہوئی ہے جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ لیبیا میں پھر جرمنی نے اقدام شروع کر دیا ہے۔

یہ موسم لیبیا میں جنگ جاری رکھنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اس لئے جیسے جیسے گرمی بڑھتی جائے گی، اس میدان میں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا اور اگر آگے چلکر یہ لڑائی کوئی اہمیت حاصل کرے تو بھی اُس سے اتحادیوں کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، کیونکہ مڈگاسکر پر انگریزی فوجوں کے تسلط نے بحر روم اور سواحل افریقہ کے اُن خطروں کو بہت ضعیف کر دیا ہے جو چند دن قبل، جاپانیوں کے وہاں تک پہونچ سکنے کے خیال سے پیدا ہو چلے تھے۔ قبضۂ مڈگاسکر کے بعد دوسری اہم بات گنرکیو کا جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا ہے، جس سے امریکہ کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور بحر اٹلانٹک میں آبدوز غارتگری کا استیصال نسبتاً آسان ہو جائے گا۔

ایشیا میں برما سے انگریزی فوجیں ہٹکر ہندوستان کی سرحد پر آگئی ہیں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ برما کی جنگ ختم ہو چکی ہے، کیونکہ اب برطانیہ و چین کے مقاصد بالکل ایک ہیں اور جس طرح برطانیہ، جاپان کی کسی کامیابی کو گوارا نہیں کر سکتا خواہ وہ اندرون چین ہی سے کیوں نہ متعلق ہو اسی طرح چین بھی اس کے کسی کامیاب اقدام کو پسند نہیں کر سکتا، خواہ اس کا تعلق برما یا اندرون ہند ہی سے کیوں نہ ہو — اس لئے برما کے بڑے حصہ پر قابض ہو جانے کے بعد بھی جاپان ابھی تک برما کی لڑائی لڑ رہا ہے اور اس وقت تک وہ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک چین کو بالکل ختم نہ کر دے۔ چنانچہ جاپان کے تازہ اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس کی فوجوں کا زیادہ زور چین ہی کی طرف ہے۔

بحر پاسفک میں بھی جاپانی تگ و دو بہت دھیمی پڑ گئی ہے اور جنرل ٹوجو (وزیر اعظم جاپان) کا آسٹریلیا کو ایشیا کے جدید نظام میں جاپان کا ساتھ دینے کی دھمکی ملی ہوئی دعوت دینا، اُن ناکامیوں کی ناکام تلافی کی کوشش سے زیادہ نہیں جو آسٹریلیا کے مسئلہ میں اسے حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہندوستان کا خطرہ دور ہو گیا ہے، درست نہیں۔

امریکہ جس انداز سے اس جنگ میں حصہ لے رہا ہے، وہ بظاہر نمایاں نہ ہو، لیکن بہت ٹھوس تدابیر پر قایم ہے اور تدریجی طور پر اتحادی کامیابیوں کو مستحکم بنا رہا ہے۔ طیارے، بحری جہاز، آبدوز کشتیاں، اور ہر قسم کا سامان حرب نہایت تیزی کے ساتھ وہاں طیار ہو رہا ہے اور اس کی بری، بحری و فضائی فوجوں نے بھی نقل و حرکت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں کے جنرل جارج مارشل کا یہ اعلان کہ امریکی فوجیں بہت جلد فرانس میں داخل ہو جائیں گی، امریکہ کے اُن وسیع عزایم و ذرایع کو ظاہر کرتا ہے جو اتحادیوں کی آخری کامیابی کے لئے وہ اختیار کر رہا ہے۔

بہرحال جس حد تک طیاریوں اور مستقبل کے ارادوں کا تعلق ہے، اتحادی اب بہت مضبوط چٹان پر کھڑے ہوئے ہیں اور محوری طاقتیں، اپنے تمام ممکن ذرایع صرف کرنے کے بعد بھی، جنگ کے ضایعات کی تلافی اپنی حربی صناعت سے نہیں کر سکتے اور اس صورت میں جنگ جتنی زیادہ طویل ہوگی، اتحادی کامیابی اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔

اگر درمیان میں کوئی اور تازہ واقعہ رونما نہ ہوا، تو جنگ کا مستقبل روس کے میدان میں بہت جلد واضح ہو جائے گا، کیونکہ لڑائی کا اصل سررشتہ جرمنی ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ روس ہی میں ہونا ہے۔ اگر اب کے موسم بہار میں وہ روس کو شکست دینے یا اسکو صلح پر مجبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، تو اس کی شکست پر مہر توثیق ثبت ہو جائے گی اور پھر جاپان کو بھی اپنے بلند ارادوں سے باز آنا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ روس میں کامیاب ہو گیا تو جنگ کی تیسری منزل شروع ہوگی اور یہ منزل یقیناً بہت زیادہ ہولناک اور پر از خطر ثابت ہوگی۔

ہندوستان کی حکومت، جاپانی خطرہ کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے، فوجی طیاریوں کا تو پورا حال معلوم نہیں، لیکن پبلک طیاریاں سب کے علم میں ہیں اور ان طیاریوں میں "اے۔ آر۔ پی" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں لوگوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ ہوائی حملہ کے وقت اُن کو کیا کرنا چاہئے اور حکومت کے ساتھ تعاون کی کیا صورتیں اس وقت مفید ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں روشنی کے گل یا کم کرنے کے متعلق جو مشق کرائی جا رہی ہے، وہ بھی ضروری چیز ہے، لیکن اس پر مسلسل اصرار کی ضرورت نہیں۔ مہینے میں ایک دو دن اس مشق و تجربہ کے لئے کافی ہیں۔

تخلیہ کے متعلق حکومت نے بہت زیادہ نرم پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کسی خطرہ کی جگہ سے بھاگنا انسان کی فطرت ہے لیکن اصولاً یہ کوئی

معقول بات نہیں۔ اس سے حکومت و رعایا دونوں کے لئے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک جگہ سے بھاگ کر دوسری جگہ جاتے ہیں، وہ خود بھی خانماں برباد ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ اول تو ابھی ہندوستان پر ہوائی حملہ کا کوئی اندیشہ نہیں اور اگر ہو بھی، تو اس کی تدبیر بھاگ نکلنا نہیں، بلکہ اپنی جگہ رہکر اس کے مقابلہ کی تدابیر اختیار کرنا ہے۔ شاید بھاگنے والے سمجھتے ہیں کہ حملہ کا مقصود محض انھیں کو ہلاک کرنا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو بھاگنے کی حالت میں اُن کی ہلاکت اور زیادہ یقینی ہے اور اگر غلط ہے تو پھر کیوں نہ پوری آبادی کی قسمت کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کرکے صبر و سکون کے ساتھ مصیبت کا مردانہ مقابلہ کیا جائے۔

جنگ کے دوران میں ایک خطرہ اندرونی بدامنی کا بھی ہوا کرتا ہے اور ملک کا جرائم پیشہ عنصر ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ لوگ گھبراکر بھاگیں اور وہ اس اضطراب سے فایدہ اُٹھاکر لوٹ مار شروع کردیں۔ اس لئے ملک کے اندر بدامنی پیدا نہ ہونے دینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ جو شخص جہاں ہے وہیں رہے اور "اندیشۂ فردا" سے متاثر ہوکر بھاگ نکلنے کی غیر شریفانہ اور بزدلانہ حرکت اختیار نہ کرے۔

"سر اسٹیفورڈ کرپس" کے ناکام واپس جانے کے بعد، یہاں کی سیاسیات کا نہایت دلچسپ واقعہ راجہ گوپال اچاریہ کا وہ رزولیوشن ہے جس میں انھوں نے "پاکستان" کے قیام کو اُصولاً تسلیم کرلیا ہے۔ راجہ جی اپنی رائے پر اس قدر استحکام کے ساتھ قایم ہیں کہ انھوں نے کانگرس کی مجلس عاملہ سے بھی استعفا دیدیا اور اب وہ کانگرس میں ایک پاکستانی جماعت علٰحدہ قایم کرنے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔

مسلم لیگ نے راجہ جی کے اس خیال کا اول اول تو بڑے زور سے خیر مقدم کیا، لیکن اب یہ زور کچھ سرد پڑگیا ہے، یہاں تک کہ مسٹر جینا نے بھی ابتک کوئی مفصل بیان اس باب میں پیش نہیں کیا — کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی چیز جو پہلے انھیں اچھی معلوم ہوتی تھی اب راجہ جی کے کہنے سے محل نظر ہوگئی ہو، کیونکہ "ساقی" کی غیر معمولی عنایتوں سے یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے "کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ راجہ جی کی یہ اپج واقعی مسلم لیگ کی حمایت میں ہے یا اس سے کسی اور "استان" کی بنیاد ڈالنا مقصود ہے، بہرحال جو مقصود بھی ہو، "متحدہ ہند" کی اسکیم کے منافی ہے اور عملاً اس کی کامیابی بہت دشوار ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ چیز "گاندھی جی" کا وہ بیان ہے جس میں انھوں نے آزادی ہندوستان کے لئے کسی بڑی زبردست تحریک کے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے — جس وقت سے گاندھی جی کا یہ ارادہ ظاہر ہوا ہے، ہر شخص اپنی جگہ قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے، لیکن آزادی۔ عدم تشدد — ستیاگرہ اور امن پسندی — ان سب کے امتزاج کی کوئی صحیح صورت سمجھ میں نہیں آتی — بہرحال گاندھی جی جو صورت بھی تجویز کریں گے وہ ایک بار ملک میں ہلچل تو ضرور پیدا کردے گی، خواہ اس کے بعد انھیں اپنی غلطی کا اعتراف ہی کیوں نہ کرنا پڑے!

"حُر" جماعت کی شورش افسوسناک بات ہے۔ روہری (سندھ) کے قریب ایک گاؤں ہے کھنگری، وہیں کے پیر کے مُرید، حُر کہلاتے ہیں ان کے پیر کا دعویٰ ہے کہ وہ سید شاہ علی مکی کی اولاد میں سے ہے جو محمد قاسم کے ساتھ حملۂ سندھ کے وقت آئے تھے (۷۱۲ء) — یہاں انھوں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کرلی تھی جو مسلمان ہوگئی تھی۔ سید شاہ علی مکی کی بعض اولاد خیرپور کے علاقہ میں بھی بس گئی تھی جن میں سے ایک پیر محمد راشد نے بڑی جماعت مُریدوں کی پیدا کرلی۔ انھوں نے تیرہ بیٹے چھوڑے اور ان میں خلافت پر جھگڑا ہوا، لیکن چونکہ وہ اپنے بیٹے صبغۃ اللہ کو نامزد کرگئے تھے اس لئے زیادہ تر لوگوں نے انھیں کی پیروی کی، پیر صبغۃ اللہ نے ان کی وفاداری دیکھ کر انھیں حُر کا لقب دیا (وہ حُر جنھوں نے کربلا میں امام حسین کا ساتھ دیا تھا) — پیر صبغۃ اللہ کے ایک مُرید نے رفتہ رفتہ اس جماعت کو بہت منظم کرلیا اور ان کے لئے مونگیا رنگ کا لمبا کُرتہ اور خاص قسم کی پگڑی مقرر کی — اس کے بعد حُر جماعت کی تاریخ گویا فتنہ و فساد کی تاریخ ہے جس میں خلافت کے جھگڑے، غارتگری اور حکومت کے خلاف بغاوت وغیرہ سب شامل ہیں اور یہ تاریخ ۱۸۹۳ء سے شروع ہوتی ہے۔

ہندوستان میں تصوف و درویشی کے بہت سے ادارے پائے جاتے ہیں، لیکن فتنہ و فساد، شورش و ہنگامہ کے لحاظ سے اس ادارہ کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے جو کچھ اس وقت ہورہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی انھوں نے بارہا سر اُٹھایا اور ہمیشہ اس فتنہ کو سختی سے دبانا پڑا۔

جھوٹوں کے بادشاہ

جھوٹ بولنے کی ابتدا کیونکر ہوئی، اس کا سراغ لگانا مشکل ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کے تاریخی دور کا کوئی حصہ اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں جھوٹ نہ بولا گیا ہو، اور اسی لئے جھوٹ کی قسموں کی انتہا نہیں

ماں اپنے بچہ سے گہوارہ ہی میں جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے، لیکن اس کا نام پیار ہے، جب بچے ہوش سنبھالتے ہیں تو باپ جھوٹ بولتا ہے اور اس کا نام "طفل تسلی" ہے بچے اپنے والدین سے جھوٹ بولتے ہیں اور اسے "طفلانہ خوف" کہتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبہ سے جھوٹ بولتے ہیں اور اس کا نام "تادیب" ہے۔ دوست دوست سے جھوٹ بولتا ہے اور اسے مذاق کہتے ہیں۔ حکومت اپنی رعایا سے جھوٹ بولتی ہے اور اس کا نام "مصلحت" ہے۔ لیکن جھوٹ بولنا محض جھوٹ بولنے کی غرض سے ۔۔۔ یہ آرٹ یقیناً بہت بعد کی پیداوار ہے

جھوٹ کی ایک قسم وہ ہے جس میں سنجیدگی کے ساتھ جھوٹ بولا جائے اور دوسرا وہ جس کا مقصود صرف لطف و مزاح ہو۔ فارسی میں بوستانِ خیال اور اُردو میں طلسم ہوشربا یقیناً دنیا کا سب سے بڑا "دفترِ کذب و دروغ" ہے، لیکن ان کا شمار اُن قصوں، کہانیوں میں ہوتا ہے، جن کو ہر پڑھنے والا جھوٹ ہی جانکر پڑھتا ہے۔ واقعاتی رنگ کے فسانوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ان میں جس قدر مبالغہ اور دورازِ عقل باتوں سے کام لیا گیا ہے وہ خود اپنے کذب کی شہادت ہیں۔ یعنی ان میں جھوٹ تو سنجیدگی کے ساتھ بولا گیا ہے لیکن محض جھوٹ کی غرض سے ۔۔۔ لطف و مزاح کے سلسلہ میں وہ تمام چھوٹے لطائف و ظرائف پیش کئے جاسکتے ہیں، جن سے ہر زبان کا لٹریچر مالا مال ہے

یوروپ کے لٹریچر میں ہمیں بعض مثالیں جھوٹ کی ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں جھوٹ پوری قوت کے ساتھ بولا گیا، اور اس مقصد کے ساتھ کہ لوگ اسے سچا سمجھیں۔ اور اس سلسلہ میں بیرن مونچاسن (Baron Munchausen) اور سالمناذار (Psalmanazar) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے

بیرن، جرمنی کا باشندہ تھا، جس نے روس کی سیاحت کرنے کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور جتنا جھوٹ بول سکتا تھا وہ سب اس کتاب میں پایا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "دورانِ سیاحت میں مجھے ایک بارہ سنگھا ملا، اس وقت میں چیری کھا رہا تھا، میں نے اس کی گٹھلی پھینک کر ماری، جو اس کے سینگوں میں لگی اور آخرکار بارہ سنگھے کے سر سے ایک پورا درخت چیری کا اُگ آیا"

یہیں روس میں اس نے ایک کوئی درخت بویا اور وہ بڑھتے بڑھتے اتنا بلند ہوگیا کہ چاند کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک اور لطیف جھوٹ ملاحظہ ہو عام طور پر چیزوں کے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں اسپرٹ میں ڈالدیتے ہیں اور وہ سڑنے گلنے سے محفوظ رہتی ہیں، لیکن بیرن لکھتا ہے کہ میں نے ایک بار ایک عمدہ گانے والے کی تانوں اور گلکریوں کو بھی اسپرٹ میں رکھ کر محفوظ کرلیا

روس کی سیاحت کے دوران میں اسے جنگلی جانوروں سے بہت واسطہ پڑا جن میں سے بعض کو اس نے رام کرلیا، اور بعض کو ہلاک کرڈالا اور بعض سے وہ بال بال بچ گیا۔ اس سلسلہ میں دو بھیڑیوں کے واقعات بہت عجیب و غریب ہیں۔ ایک بھیڑئے کو تو اُس نے پکڑکر لگام چڑھادی اور گاڑی میں جوت کر سنٹ پیٹرسبرگ سے بارہ روز میں اسے لئے پھرا، اور دوسرا بھیڑیا وہ تھا جس کے حلق کے اندر ہاتھ ڈالکر وہ دُم تک لے گیا اور پھر ہاتھ باہر کھینچکر بھیڑئے کو اس طرح اُلٹ دیا جس طرح دستانہ کو اُلٹ دیتے ہیں، یعنی بھیڑئے کے جسم کا بیرونی حصہ اندر ہوگیا اور اندرونی حصہ باہر آگیا

بیرن کوئی فرضی ہستی نہیں تھا بلکہ روسی فوج میں ایک افسر کی حیثیت رکھتا تھا، جس نے ۱۷۴۰ء میں ترکوں کی لڑائی کے بعد پنشن لی اور اپنے عجیب و غریب تجربات برلن کے بعض رسایل میں شایع کرائے۔ اتفاق سے ایک شخص نے جس کا نام راسپ (Raspe) تھا ان مقالات کو غور سے پڑھا اور اس نے سوچا کہ

اگر ان سب کو یکجا مسلسل واقعات کی طرح شایع کر دیا جائے تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ جرمنی میں رہنے کے بعد وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اس لئے بھاگ کر انگلستان آیا اور اس طرح بیرن کے سفرنامہ کا سب سے پہلا اڈیشن انگریزی زبان میں شایع ہوا

یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ انگریزی زبان کے طنز نگاروں نے ہر نئے اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا شروع کیا، لیکن یہ اضافہ کوئی اچھا پیوند نہ تھا، اس لئے رفتہ رفتہ لوگوں کی دلچسپی کم ہونے لگی

بیرن کے جھوٹ اور دوسرے لوگوں کے اضافہ میں یہ فرق تھا کہ بیرن کے جھوٹ میں سچ کا انداز تھا اور ہلکی سی ظرافت جو دوسروں کے حاشیہ آرائی میں مفقود تھی گویا وہ ایک ایسا لطیفہ گو تھا جو بغیر ہنسے ہوئے دوسروں کو ہنسانا چاہتا تھا۔ علاوہ بریں، اس کے جھوٹ میں ایک منطقی استدلال بھی ہوا کرتا تھا اور بچوں کی سی سادگی بھی جو ہر بات پر حیران ہو جاتے ہیں

وہ لکھتا ہے :- "میں ایک بار کسی گاؤں میں پہونچا جو شدید برفباری کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا، میں نے اپنا گھوڑا کھونٹا سمجھ کر ایک لکڑی سے باندھ دیا جو زمین سے ابھری ہوئی نظر آتی تھی، رات بھر میں برف پگھل گئی اور صبح کو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا ایک منارہ کے بادنما سے بندھا ہوا ہے" مطلب یہ کہ برفباری کی کثرت سے پورا منارہ چوٹی تک چھپ گیا تھا اور صرف بادنما کا حصہ کھلا ہوا باقی رہ گیا تھا جسے کھونٹا سمجھ کر اس نے گھوڑا باندھ دیا تھا، اس لئے جب برف پگھل گئی تو گھوڑا بادنما سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا

ایک دفعہ اس کے پوستین کے کوٹ کو کسی بادلے کتے نے کاٹ لیا۔ تو کوٹ بھی دیوانہ ہو کر کتے کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا

ایکبار اس کا دستہ کسی گاؤں میں پہونچا جہاں سخت برفباری ہو رہی تھی۔ سوتے وقت اس نے بگل بجایا، لیکن اس سے کوئی آواز پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے دن جب وہ کسی اور مقام پر پہونچا جہاں سردی کم تھی اور بگل کو کھونٹی پر لٹکا دیا تو اس سے وہی آواز نکلنے لگی جو پہلے نہ نکلی تھی۔ یعنی وہ آواز جو سردی کی شدت سے بگل کے اندر جمکر رہ گئی تھی، گرم جگہ پہونچکر سنائی دینے لگی

بیرن کا جھوٹ ایک طرح سے گویا جن و پری کی کہانیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور جو یوروپ کے بعض قصے کہانیوں سے اخوذ معلوم ہوتا ہے، مثلاً درخت کا اگ کر پانی تک پہونچ جانا کہ یہ بعینہٖ یہی کہانی جرمنی کے Fairy tales میں بھی پائی جاتی ہے

جرمن زبان میں اس قسم کی کہانیاں بہت پائی جاتی ہیں اور (Schilda) کے رہنے والوں سے اس قسم کے احمقانہ واقعات اکثر منسوب کئے جاتے ہیں سرزمین شلارافن لینڈ کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں، جہاں اسی شخص کو بادشاہ بنایا جاتا تھا جو سب سے بڑا جھوٹ بولنے پر قادر ہو۔ چنانچہ ایک شخص کو اس روایت پر بادشاہ بنایا گیا کہ اس نے بھٹکے ہوئے مسلم سوروں کو ادھر ادھر لوگوں کے پاس جاتے اور کھانے کی درخواست کرتے ہوئے دیکھا تھا

انگریزی زبان میں اس قسم کے ادب کا عنصر بہت خفیف ہے۔ للی پٹ (Lilliput) کے یہاں طنز کا حصہ زیادہ غالب ہے اور شاعری کا کم۔ بیرن کی طرح دروغ بافی زیادہ تر سیاحوں کے یہاں پائی جاتی ہے، لیکن بیرن کے بعد سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ جھوٹ بولنے والا سالمناز رہوا ہے ——— یہ لینگوئی ڈاک کا رہنے والا تھا جو اپنے داستان گوئیوں کی وجہ سے مشہور ہے

بیرن کا جھوٹ تو ایک قسم کا تفریحی جھوٹ تھا جس سے مقصود دھوکا دینا نہ تھا، لیکن اس شخص نے تو جھوٹ کی ایک عمارت کھڑی کر دی اور عرصہ تک لوگوں کو اپنے پر گمان رہا۔ اس کی عمر ابھی ۲۰ سال کی بھی نہ تھی کہ ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے سیاحت شروع کر دی، لیکن یہ سیاحت یوروپ سے باہر کی نہ تھی، کئی دنوں تک غائب رہنے کے بعد جب واپس آیا تو وہ بالکل دوسرا شخص تھا، یعنی یہ اپنے آپ کو جاپان کا باشندہ بتانے لگا اور اسی کے ساتھ جزیرۂ فارموسا کے حالات سیاحت بیان کرنے لگا جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا

اس نے یہ حالات جاپانی زبان میں لکھے حالانکہ وہ اس زبان سے ناواقف تھا، اس طرح اس نے گویا اپنی طرف سے ایک زبان علٰحدہ ایجاد کی (جسے وہ جاپانی کہتا تھا) اور اس زبان میں اس نے جاپانیوں کی معاشرت اور ان کے مذہبی رسوم کی تاریخ لکھی، جاپانی زبان کی گرامر ایجاد کی اور بہت سے ایسے اعداد و شمار پیش کئے جنھیں ایک جاپان کا باشندہ ہی بتا سکتا تھا۔ الغرض یہ شخص اس قدر محنت و سلیقہ سے جھوٹ بولا کہ لوگ عرصہ تک اس کو سچ سمجھتے رہے اور شاید دنیا کی تاریخ میں یہی پہلا شخص ہے جس نے جھوٹ بولنے کا ایسا زبردست ریکارڈ قائم کیا ——!

اے حُجرہ نشینو!

شکن ڈالے پڑے ہو، خاک آلودہ جبینوں میں
چھپائے دست و بازو لمبی لمبی آستینوں میں

یہ وسعت کا تسلّط ہے دماغِ زہد پرور پر
تناسب ہے قیاسوں میں، نہ گہرائی قرینوں میں

وہی وقتی تضرّع ہے، وہی رسمی جبیں سائی
غلامی اینڈتی پھرتی ہے مسجد کے مکینوں میں

سمجھتے ہو تمہارا دل نہیں، عرشِ الٰہی ہے
خُدا کو بند کر رکھا ہے تم نے اپنے سینوں میں

ابوجہلو! تمھیں عرفاں نہیں اس راز کا شاید
خدا اب جلوہ فرما ہے بموں اور گن مشینوں میں

کشاکشہائے نظمِ عالمِ امکاں میں ملتا ہے
وہ حُجروں میں نہیں، اب جنگ کے میداں میں ملتا ہے

نہیں ہے امتدادِ وقت کا تم کو یقیں اب تک
کہ تم ہو دورِ ماضی کی طرح بارِ زمیں اب تک

ہوئی مدت کہ تم نے سلب کر لی روحِ ملّت کی
رہے میّت فروشِ مذہبِ ایماں و دیں اب تک

نماز و سجدہ تک محدود استعداد و ہمّت ہے
وضو میں صرف چڑھتی ہے تمہاری آستیں اب تک

روایاتِ کُہن کا درس اب بھی دے رہے ہو تم
خبر کچھ انقلابِ بزمِ ہستی کی نہیں اب تک

قیامت ساحلِ مشرق سے ٹکراتی ہے سر اپنا
مگر اے بزدلو! تم ہو یہاں حُجرہ نشیں اب تک

تمہارا خانوادہ قوم کا اک جُزوِ مُہمل ہے
جو ہے اسلام کا داعی، وہی طبقہ معطّل ہے

سبق تیرہ صدی پہلے کے ابتک ہیں زبانوں پر
کیا کرتے ہو تم لفظوں سے جادو نوجوانوں پر

حوادث سے زمیں کا گوشہ گوشہ شعلہ بر سر ہے
دماغ ابتک تمہارے ناچتے ہیں آسمانوں پر

حدیثِ ارتقا ایسی اذانِ بزمِ ہستی ہے
کہ سنتے ہی جسے تم ہاتھ رکھ لیتے ہو کانوں پر

خدا اُن کے بنے بیٹھے ہو تم زعمِ تقدس میں
پڑے رہتے ہیں جو جاہل تمہارے آستانوں پر

عصا و جبہ و عمامہ اسبابِ نمائش ہیں
مقدس جال ہیں یہ لمبے لمبے بال شانوں پر

شکاری قوم کے ہو - تاجرِ علم و عقیدت ہو
حقیقت میں تمھیں وجہ زوالِ اہلِ ملت ہو

چھپے بیٹھے ہوئے ہو تم قدامت کے نقابوں میں
مسلسل، عورتوں کی طرح رہتے ہو حجابوں میں

اُٹھو، اور دو ثبوت اسوقت اپنے مرد ہونے کا
کہ تم ہو مجلسِ اہلِ وطن کے باریابوں میں

تحفظ میں وطن کے - ساتھ اربابِ وطن کا دو
وطن ہے مبتلا اسوقت صد گونہ عذابوں میں

سوادِ ہند کے چاروں طرف بارود پھیلی ہے
نہیں معلوم کس دن آگ لگجائے شتابوں میں

یہ حجرے ہی تمہارے مستقل مدفن نہ بن جائیں
کہیں تم دب کے رہ جاؤ نہ بوسیدہ کتابوں میں

ہے عہدِ جنگ، ذہنیت بدل کر باہر آجاؤ
جو زندہ ہو تو حجروں سے نکل کر باہر آجاؤ

سیماب اکبرآبادی

بھگتی تحریک کے شاعر

علم وادب کا احیاء

امیر خسرو کے بعد کچھ عرصہ تک ادب کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زمانہ شعر و شاعری کے لئے سازگار نہ تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس دور میں مذہب کا بہت زور رہا۔ مذہب کی تبلیغ کے لئے شاعری کو ایک ناکارہ سی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے نظم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آخر کار جس مذہبی تحریک کی بدولت ہندی شاعری کو دیس نکالا ملا تھا وہی ڈیڑھ دو سو برس کے بعد اس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں ویشنو مذہب کا پھیلنا تھا کہ ہندی ادب میں جان پڑ گئی۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوؤں میں ایک بھاگ دوڑ مچ گئی۔ یہی حال ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کا ہوا تھا جسے ترکوں نے فتح کیا تھا۔ وہاں کے یونانی عالم اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بختیار کے بیٹے محمد خلجی نے جب بہار فتح کیا تو سارا ہندوستان سہم گیا۔ بڑے بڑے عالم پنڈت اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے چن چن کر بت توڑے اور مندر برباد کئے لیکن اس سے ہندو مذہب فنا نہ ہو سکا۔ ہندو مذہب کا فلسفہ ایسا اٹل ہے کہ اگر رسم و رواج کا خاتمہ بھی ہو جائے پھر بھی ہندو دھرم اس فلسفہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمان پرانے مذہب کو مٹا نہ سکے ورنہ جہاں کہیں بھی یہ گئے انھوں نے سارے ملک کو مسلمان بنا دیا۔ چنانچہ مذہب اسلام سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے ویشنو دھرم کا پرچار ہوا لیکن آگے چل کر ان دونوں کے عناصر اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ ایک اور مذہب پیدا ہوا جسے 'صوفی مت' کہتے ہیں۔ اس طرح ہندو مسلمانوں کے خیالات میں بڑی حد تک یگانگت پیدا ہو گئی جیسے پھر کبھی نہ پیدا ہوئی۔

بھگتی تحریک کو تین شاخوں میں منقسم کر سکتے ہیں (۱) رام کی بھگتی (۲) کرشن کی بھگتی اور (۳) صوفی مت۔ یہ لازم ہے کہ ان تحریکوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھا جائے کیونکہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اتنی بات تو ہر ویشنو، چاہے وہ کسی فرقہ کا ہو، مانتا ہے کہ خدا انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے یعنی اوتار لیتا ہے اور انسان اس کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہے۔ یہی مکتی یا نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ یہ فلسفہ بڑا دلکش تھا، اس کے مقابلہ میں برہمنوں کا فلسفہ وحدانیت جس کے بانی شنکراچاریہ تھے بہت خشک تھا۔ چنانچہ ویشنو دھرم کے بے شمار پیرو کار ہو گئے اور برہمنوں کا زور دن بدن کم ہونے لگا۔ ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ویشنو تحریک برہمنوں کا اقتدار کم کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ ویشنو مذہب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی تھیوسوفی (Theosophy) سے کیا جا سکتا ہے جس میں محض رسم و رواج کی پابندی کا نام مذہب نہیں ہے بلکہ جس کا واحد مقولہ یہ ہے کہ 'خدا محبت ہے اور محبت خدا' (God is love and love is God) جب یہ حال ہو تو ویشنو مذہب کیوں نہ مقبولِ عام ہوتا۔ اس کی بے نظیر مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس نے سنسکرت کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان میں دھرم کا پرچار کرنا شروع کیا۔ اس لئے مذہب کے دائرہ میں اس نے جو کچھ کیا وہ تو ایک الگ چیز ہے۔ لٹریچر پر اس کے احسانات بہت زیادہ ہیں چنانچہ قدیم ہندی نظم کا سب سے خوشگوار حصہ وہی ہے جو رام اور کرشن کے بھگتوں نے لکھا ہے۔

تحریک بھگتی کا آغاز

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بھگتی تحریک کی ابتدا رامانند سے ہوئی لیکن ان سے پہلے بھی بعض بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے رامانند کے لئے شاہراہ طیار کی تھی چنانچہ سکھوں کی مقدس کتاب "آدی گرنتھ صاحب" ہے جس میں بہت سے قدیم شاعروں کا کلام ہے۔ اسے ۱۶۰۴ء میں گرو ارجن نے مرتب کیا تھا۔ اس میں بھگتی کے اشعار بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں[1]۔ ان سے بہت پہلے سرن اور نام دیو دو شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں بہت زیادہ حسن اور شیرینی ہے۔ عہدِ قدیم کا ایک اور شاعر ہے جس کا نام جے دیو ہے۔ یہ "گیتا گوبند" نامی مشہور کتاب کا مصنف بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ کوئی اور شخص رہا ہوگا ہم نے جس شاعر کا ذکر کیا ہے اس کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ اس کا کلام ہی دستیاب ہو سکا۔

---

[1] گرنتھ صاحب کسی ایک آدمی کی تصنیف نہیں ہے اس میں بہت سے شاعروں کا کلام پایا جاتا ہے چنانچہ کبیر کا بہت سا منتخب کلام اس میں شامل کیا گیا ہے۔ قدیم ترین بھگتی شاعروں کے اشعار بھی اس میں پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے یہ ایک نادر کتاب ہے۔

سرن پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس کی پیدائش سندھ میں کسی قصاب کے گھر ہوئی تھی لیکن اس نے اپنا آبائی پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا اور ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دی۔ 'گرنتھ صاحب' میں اس کے دو حمد ملتے ہیں۔

نام دیو، مرہٹہ دیس کا رہنے والا تھا اور 'پوربندر پور' کے 'وٹھوبا' کا چیلا تھا۔ وہ غالباً پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ ذات کا درزی تھا۔ پہلے اس نے اپنے پیشے کی طرف بہت توجہ صرف کی لیکن جب اس میں نفع کی صورت نہ دیکھی تو ڈاکوؤں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ آخر اس نے اس مکروہ پیشہ سے توبہ کی اور سادھو ہو گیا[1] اس کی شاعری کا دور بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نام دیو نے اپنی مادری زبان مرہٹی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہندی میں بھی اس کا کلام بہت وافر ہے۔ اسکے بہت سے حمد گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ نام دیو کی مختلف الجہتیات شخصیت بہت دلچسپ ہے۔ مذہب ہو یا ادب دونوں حیثیتوں سے بہت کم انسان ایسے گزرے ہیں جو اس کی صف میں کھڑے کئے جا سکیں۔

رامانند غالباً رامانند کا عہد زندگی ۱۴۰۰ء ہے۔ انھوں نے رام چندر جی کو خدا کا اوتار مانا ہے اور اس کی تعلیم زندگی بھر دیتے رہے۔ ان کے خیال میں رام کی بھگتی سعادت اولین ہے جس سے انسان 'آواگون' کی زنجیروں سے نجات پا جاتا ہے۔ رامانند اس عقیدہ کے بانی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے نام دیو اور سرن یہی درس دے گئے تھے البتہ ان کی تعلیم کسی منظم تحریک کی صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آئی اس لئے رامانند کو مواد طیار ملا اور انھوں نے اپنی تحریک میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بنارس میں قیام کیا اور یہیں اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے پیروؤں میں قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی انھیں اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

لیکن اس پر عظمت زندگی سے ادب کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ بحیثیت شاعر کے ان کا مرتبہ بلند نہیں ہے ـــ گرنتھ صاحب اور بعض دیگر مجموعوں میں ان کا ہندی کلام موجود ہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ خدا انسان کے دل میں ہے۔ اس کا نور ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے، پھر ہم کیوں اسے مندر یا مسجد میں تلاش کریں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رامانند بت پرستی کے خلاف تھے گو انھوں نے اس طرز عبادت پر حرف ضرور رکھا ہے۔ وہ رام کے بھگت تھے لیکن بت پرستی کو جائز سمجھتے تھے۔ "تثلیث" کے بھی قائل تھے اور ہندو دیومالا کی بڑی قدر کرتے تھے۔

بھگتی دھرم کا خاص اصول یہ ہے کہ اگر انسان میں سچی لگن ہے تو خدا ضرور مل جاتا ہے۔ کون ایسا انسان ہے جسے خدا کی تلاش نہ ہو، پس رامانند کے مذہب میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ و طبقہ کے لوگ شامل ہو گئے۔ ہندو مسلمان، شودر اچھوت، مرد عورت سب نے ان کے مذہب کو لبیک کہا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مساوات اور رواداری کے باوجود بھی ذات پات کی بندھن نہیں ٹوٹی بلکہ دن بہ دن مضبوط ہوتی گئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ در پردہ برہمنوں کا اب بھی زور تھا اور مذہب اسلام کے سامنے ذات پات کی آہنی دیوار قایم کرنے کا جذبہ دن بہ دن دلوں میں موجزن ہوتا جا رہا تھا۔ رامانند اور ان کے چیلوں نے سنسکرت کو دور ہی سے سلام کیا اور ہندی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ ٹھہرایا۔ ہندی کی تحریک اس طرح ایک مخصوص طبقہ سے نکل کر عوام میں پہونچی۔

رامانند کے شاگردوں میں بارہ زیادہ مشہور ہیں جن کا کلام ابھی تک محفوظ چلا آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر راجہ پیپا ہیں جو گلروں گڑھ کے راجہ تھے۔ انکی ولادت ۱۴۴۵ء میں ہوئی تھی۔ رامانند کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد انھوں نے راج پاٹ چھوڑ دیا اور فقیر ہو گئے۔ دوسرے دھنا جاٹ تھے جو ان سے دس سال پہلے پیدا ہوئے تھے، ان کی نسبت مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ سین، مہاراجہ ریواں کے یہاں نائی تھا۔ اس کے بعض دوہرے گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ عبادتند، امرت دھارا نامی کتاب کے مصنف تھے، اس کا موضوع ویرانت ہے۔ یہ کتاب چودہ فصلوں میں ہے۔ رے داس ذات کے چمار تھے لیکن ان سے زیادہ سچا بھگت شاید بھگتی کی تاریخ میں کبھی نہ پیدا ہوا ہوگا۔ رے داس جیتے تھے تو رام کے لئے اور مرتے تھے تو رام کے لئے۔ ان کی عظمت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرا بائی ایسی بھگت ان کی چیلی تھی۔ رے داس کے تیس حمد گرنتھ صاحب میں درج ہیں۔

کبیر داس مذہبی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے کبیر داس رامانند کے شاگرد رشید کہے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ وہ کسی بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے اپنی لاج رکھنے کے لئے بچے کو بنارس کے قریب کسی تالاب[2] میں پھینک دیا ایک جولاہے نے جس کا نام نیرو تھا یہ دلخراش منظر دیکھا اور تالاب میں کود کر بچے کو نکال لایا۔ اس کی بیوی جس کا نام نیمہ تھا بچے کو پا کر بہت خوش ہوئی۔ یہ دونوں بیچارے اولاد کو ترس گئے تھے انھوں نے اس بچے کو پالا

---

[1] وٹھوبا کے مصنف رامانند کے بارے میں بھی اسی طرح کا قصہ مشہور ہے۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر کی نسبت بھی ایسی ہی ایک روایت سنی جاتی ہے۔ [2] اس تالاب کا نام میرا تارا ہے۔

پوسا اور اس کا نام کبیر رکھا۔ کبیر کی نسبت ایک روایت اور بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ جوان تھے اس زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں ان سے ناراض ہو گئے۔ ہندو اس وجہ سے برہم تھے کہ کبیر نے اچھوتوں کو جنیو پہننے کی اجازت دیدی تھی، مسلمان اس وجہ سے خفا تھے کہ انھوں نے رام کو خدا کا اوتار مانا تھا۔ لوگ طعنے دیتے تھے کہ تمھارے تو کوئی گرو ہی نہیں۔ کبیر کے لئے یہ کلنگ کا ٹیکا تھا اسے مٹانے کے لئے انھوں نے رامانند کا ساتھ کیا۔ پہلے اس میں کلام تھا گر وانھیں اپنے مریدوں میں شامل کریں گے یا نہیں اس لئے انھوں نے یہ سوانگ رچا کہ عبور کے وقت گھاٹ کی سیڑھی پر لیٹ گئے۔ ادھر ہی سے گرو جی کا گزر ہوتا تھا۔ جب وہ سیڑھی کے سہارے نیچے اترنے لگے تو ان کے پیر کبیر کے بدن سے لگ کر لڑکھڑا گئے اس پر انھوں نے "رام رام" کہا۔ یہ کلمہ منھ سے نکلنا تھا کہ کبیر ان کے چیلے ہو گئے۔ اب کبیر رامانند کے نقش قدم پر چلنے لگے اور ایسے پختہ کہ مرید اپنے گرو سے بہت آگے نکل گئے، ان کا مذہب "کبیر پنتھ" کہلاتا ہے جس کے ماننے والے اب بھی شمالی ہندوستان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کبیر مسلمان تھے اس وجہ سے ان کی تعلیم میں اسلامی رنگ بھی موجود ہے۔ انھوں خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیا ہے۔ خدا کے لئے وہ 'رام' 'ہری' 'گوبند' اور 'اللہ' وغیرہ ہر طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کبیر کو اوتاروں پر اعتقاد نہ تھا۔ بت پرستی اور اس طرح کے بہتیرے "پاکھنڈوں" سے انھیں سخت نفرت تھی۔ چونکہ لوگ برہمنوں کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے تھے اس وجہ سے انھیں کبیر کی تعلیم بہت پسند آئی۔ کبیر کو وہی کامیابی نصیب ہوئی جو ان سے تقریباً دو ہزار برس پہلے گوتم بدھ کو ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جو مذہب کا اس قدر اثر ہے وہ انھیں مہاتماؤں کی تعلیم کی بدولت ہے (ملاحظہ ہو کتاب "کبیر اینڈ کبیر پنتھ"، مصنفہ پادری ای۔ سی ڈیوک)

کبیر پنتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف کبیر کے چیلے[1] ہی نہیں بلکہ اور متوں کے ماننے والے بھی ان کے اصولوں سے بہت فیض اٹھاتے ہیں۔ ان بہت سے متوں کے پھیل جانے سے شاعری کا رواج بہت بڑھ گیا اور اس طرح ادب کا ذخیرہ بھی وسیع ہو گیا۔ کبیر کی نسبت سیکڑوں روایات مشہور ہیں لیکن ان میں بہت کم صداقت کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ کبیر نے اپنے مذہبی خیالات کی دھن میں کبھی کبھی اپنے کنبہ والوں کو ناراض بھی کر دیا تھا۔ یہی نہیں ہندو مسلمان ہر ایک ان سے ناراض تھا۔ یہ مخالفت ساری زندگی ان کے لئے سوہان روح رہی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ کبیر ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ سکندر لودی جو اس زمانہ میں بادشاہ تھا کبیر پر بہت برہم ہوا اور انھیں قید کر لیا۔ رہائی کے بعد بھی انھیں حکم دیا کہ بنارس سے نکل جائیں۔ آخر انھیں بنارس چھوڑنا پڑا اور قصبہ مگہر ضلع گورکھپور میں قیام کرنا پڑا۔ یہیں پیرانہ سالی میں ان کا انتقال ہوا۔

کبیر کی نظمیں بے شمار ہیں جس کا ایک نادر مجموعہ بابو شیام سندر داس نے "کبیر گرنتھاولی" کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں، انھوں نے بھگتی تحریک پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ کبیر کی نسبت جو عام طور پر مشہور ہے کہ انھوں نے صنف نازک کی بڑی خدمت کی ہے، اس کی مولف موصوف نے پر زور تردید کی ہے۔ کبیر کے مذہب، ان کے گرو کا نام، ان کے شاگردوں کی تعداد، اور ان کے سنہ وفات کی نسبت سخت اختلاف ہے لیکن ڈاکٹر "میورا" کی سند پر ہم نے جو حالات کبیر کے درج کئے ہیں وہی تحقیق سے صحیح معلوم ہوتے ہیں[2]۔

کبیر کا مذہب صوفیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے یہاں تک کہ ان پر بھی بادشاہ وقت کا قہر اسی طرح نازل ہوا جس طرح عرب میں منصور حلاج پر "انا الحق" کہنے کے باعث نازل ہوا تھا۔ کبیر کی آزاد روی ان کے ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ وہ دنیا کو "مایا جال" سمجھتے تھے اس لئے اس کی ترغیبات میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ انکا مذہب انسان کا مذہب تھا ہندو مسلمان کا مذہب نہیں ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے اپنے کلام کو خود تحریر کا جامہ نہیں پہنایا۔ غالباً یہ ان کے شاگردوں نے کیا۔ کبیر کے بہت سے مجموعے موجود ہیں لیکن ان میں بہت سا حصہ ایسا ہے جس کے وہ مصنف نہیں تھے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا حصہ "گرنتھ صاحب" میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ "بیجک" (مخفی خزانہ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب کبیر پنتھیوں کی مذہبی اور مقدس کتاب ہے۔ اسے بھاگو داس نے ترتیب دی جنھیں کبیر سے بڑا اعتقاد تھا۔ یہ کوئی مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی نظمیں ہیں جن میں اکثر کی بحریں مختلف ہیں۔ ایک اور مجموعہ نظم "رامینی" ہے جس میں ان کے تمام مذہبی اصول اکٹھا کر دئے ہیں۔ "سیرہ" نامی اسی طرح کی نظم ہے لیکن اس کی بحر رامینی سے مختلف ہے۔ چونتیسا میں ناگری رسم الخط کی مذہبی اہمیت کا ذکر ہے۔ وپرتیسی میں برہمنوں کی قدامت پرستی پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ "کہرا"۔ "بسنتا"۔ "بیلی"۔ "چاچری"۔ "برہولی"۔ اور "ہندولا" بھی مذہبی رنگ کی نظمیں ہیں۔ جن بحروں میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے بھی یہی نام ہیں۔ ان نظموں میں لگ بھگ چار سو ساکھی (بند) ہیں۔ گرنتھ صاحب کا وہ حصہ جو کبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

---

[1] کبیر کے پیر شیخ تقی نامی ایک بزرگ تھے۔ کبیر کے دو چیلے دھرم داس اور گوپال بہت مشہور ہیں۔ کبیر کی بیوی کا نام لوئی اور بیٹے کا نام کمال تھا۔ (ماخوذ از شیام سندر داس)

[2] ملاحظہ ہو: Antiquies of the North Western Provinces by Dr: Fichrer

سب کا سب انھیں کی تصنیف نہیں ہے۔ اسی طرح 'بیجک'، جو کبیر کی تصنیف سمجھی جاتی ہے اس میں آدھے سے زیادہ اشعار دوسروں کے کہے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ ہزار سے زیادہ دوہے کبیر کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ محلہ کبیر پور اشہر بنارس میں کبیر کی ایک کتاب ملی ہے اس میں ان کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہے۔ اس کتاب میں بیس ابواب ہیں جس میں زیادہ تر حصے شاگردوں کے لکھے ہوئے ہیں لیکن یہ اب تک شایع نہیں ہوئے۔ بیجک اودھی زبان میں ہے اس لئے کبیر کے بقیہ کلام سے مختلف ہے جس کی زبان عامیانہ اور سوقیت سے بھری ہوئی ہے[1]۔ زبان تو گنوارو ہے ہی اسلوب بیان بھی سخت عامیانہ ہے۔ الفاظ ایک دوسرے میں زبردستی گتھ دیے گئے ہیں۔ حرفی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ جملے ادبی حیثیت نہیں رکھتے صرف گنواروں کی بول چال میں کام آسکتے ہیں۔ صنعت ایہام اور صنائع بدائع کی اس قدر بھرمار ہے کہ بعض اوقات مطلب گم ہوجاتا ہے۔ باوجود ان سب خامیوں کے کبیر کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔ "پاکھنڈ" یعنی ظاہر پرستی کے انھوں نے پرخچے اڑا دیے، خدا پرستی کا صحیح اور سب سے آسان راستہ بتایا۔ یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ ان کے اشعار دل میں چبھنے والے اور جذبات کو ابھارنے والے ہوتے ہیں۔ ہندی شاعری کا انھیں باوا آدم کہا جاتا ہے۔ شاعری میں جو ایک صنف حمد و ثنا کی بہت مقبول ہے اس کے بانی یہی ہیں۔ انسے پیشتر جو شعرا گزرے ہیں ان کی تعلیم اس قدر عام نہ ہوسکی تھی۔ کبیر نے مختلف مذاہب اور اعتقادات کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ کبیر کے بعد جو لوگ ہوئے وہ انھیں کے نقش قدم پر چلے۔ کبیر کے خیالات ہندوستان میں اس قدر مقبول ہیں کہ شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور انھیں کے خیالات سے مستفید ہوکر "گیتان جلی" لکھی جس پر انھیں دنیا کا سب سے بڑا انعام "نوبل پرائز" ملا۔ ملاحظہ ہو (Hundred Poems of Kabir by Sir: Tagore)

ایک خاص بات جو کبیر اور ان کے دور کے تمام شعرا میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ایک خاص پیغام کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری شاعری میں آج یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ہم خود نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی جمع پونجی وہی چند عشقیہ باتیں، ہجر و فراق اور ز کے مضامین ہیں۔ ہم اس بدنما داغ کو دھونے کے لئے اس سے بہتر اور کیا کام کرسکتے ہیں کہ کبیر، نانک اور چیتنیہ کی طرح اپنی شاعری کا ایک خاص مقصد بنالیں۔ دنیا کے تمام مذہب ملکوں میں یہی ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کی بنیاد پڑ چکی ہے لیکن ہنوز ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

کبیر کے ایک بیٹے کمال نامی تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کی تمام تعلیم کو مٹی میں ملا دیا اور اس کی سخت تردید کی اسی وجہ سے ایک بار کبیر نے خود کہا تھا:-

"میرے کو کھ لے سانپ جنما ہے" یعنی میری اولاد سخت نالائق ہے۔

نانک کبیر کی تعلیم سے جتنے مذاہب پیدا ہوئے ان میں نانک کے مذہب نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ نانک کا زمانہ حیات (۱۴۶۹-۱۵۳۸ء) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ ۲۷ برس کے تھے تو ان کی ملاقات کبیر داس سے ہوئی۔ اس ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ نانک کے خیالات بھی کبیر سے ملنے جلنے لگے۔ یہاں تک کہ نانک ہندو مذہب سے کبیر کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔ عرصہ تک گرو نانک اپنے شاگرد مردانہ کے ساتھ ادھر ادھر پھرتے رہے[2]۔ مردانہ کو ساز بجانے میں اچھی مہارت تھی۔ اس کے گانے ملتے ہیں ان میں پنجابی اور ہندی کی کھچڑی ہوتی ہے۔ اگرچہ بہ حیثیت شاعر اس کا مقابلہ کبیر سے نہیں کیا جاسکتا پھر بھی اس کے اشعار میں شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ نانک کے بہت سے چیلے تھے جو عبادت کے وقت گرو کے بھجن گایا کرتے تھے۔ "گرنتھ صاحب" میں نانک کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔

رام بھگتی کا دور رامانند اور کبیر داس ہی تک ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس تحریک کے روشن ترین ستارہ تلسی داس ہیں۔ ان کے بعد بھی اس کا بہت زور رہا۔ چونکہ مذہب ہندوستان کی روح ہے اس لئے رام اور کرشن کی بھگتی ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ البتہ اس کے ادبی رجحانات کو سمجھنے کے لئے رامانند، کبیر، تلسی داس اور نانک کا کلام کافی ہے۔ اب رہا کرشن بھگتی کا اثر، اس مضمون میں اس کا ہم تفصیل سے ذکر نہیں کرسکے کیونکہ یہ موضوع طویل ہے۔ انشاءاللہ کسی آیندہ مضمون میں اسکی وضاحت کی جائے گی۔

گوری سرن لال سریواستو ایم۔اے (علیگ)

---

[1] کبیر نے خود لکھا ہے "میری بولی پوربی" لیکن ان کی زبان میں اودھی، راجستھانی، پنجابی اور پوربی کا "معجون مرکب" ہے۔ ماخوذ از شیام سندر داس

[2] کبیر کے اشعار کھردرے ہیں۔ ان میں ادبیت کی چاشنی نہیں ہے۔ (شیام سندر داس)

[3] نانک صاحب اولاد بھی تھے لیکن بعد میں انھوں نے ترک و تجرید اختیار کرلیا تھا۔

[4] نانک کی بعض فارسی غزلیں بزرگوں کی زبانی سنی ہیں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

عقلیت کیا ہے؟

دنیا کی ہر شئے انقلاب پذیر ہے۔ ہر چیز، ہر لمحہ، ہر گھڑی تبدیل ہو رہی ہے۔ جو صورت کل تھی وہ آج نہیں، جو آج ہے کل نہ ہوگی۔ کسی چیز کو قیام نہیں اگر قیام ہے تو فقط تبدیلی کو۔

ہر شئے کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہبی تصورات اور سماجی و اخلاقی قدروں میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ کبھی قدما کے ہر قول و فعل پر آمنا صدقنا کہنا ہمارا شیوہ تھا۔ جو کچھ وہ کہہ گئے اُس میں سرمو تبدیلی کرنا یا ان کی کسی بات پر شک کرنا گناہِ عظیم تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ جو وہ کہہ دیں اسی کو صحیح سمجھو۔ نہ تجربہ سے حقیقت سمجھنے کی ضرورت، نہ شاہدے کو دلیل راہ بنانے سے غرض۔ مگر یہ حالت بھی قایم نہ رہ سکی۔ آفتابِ علم کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی تمازت نے صدیوں کے منجمد اور متحجر خیالات کو پگھلانا شروع کیا، انسانی دنیا پُرانے خیالات، قدیم رسم و رواج اور مذہبی عقاید کی سچائی میں شبہ کرنے لگی۔ محض اندھی تقلید اور اعتقادیت سے انسان کی تسلی نہیں ہوئی حقیقت اور سچائی کے شیدائی گرم خوردہ کتابوں کی ورق گردانی کی بجائے براہ راست فطرت کا آزاد مطالعہ کرنے لگے۔

پہلے مذہبی عقیدوں اور مفروضہ حقیقتوں کے مطابق قدرتی مظاہر کی تشریح کیجاتی تھی۔ اب ہر کیفیت کا طبعی سبب ڈھونڈھا جانے لگا۔ اندھی تقلید کی بجائے عقل کو فوقیت حاصل ہونے لگی۔ دماغی غلامی کی زنجیریں ایک ایک کرکے کٹنے لگیں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قدما کے بسیط عناصر اربعہ کا تجزیہ کرکے اُنھیں ۹۹ عناصر میں تبدیل کر دیا۔ زمین جسے کائناتِ عالم کے مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا سورج کا ایک ادنےٰ سا سیارہ ہو کر رہ گئی۔ ستارے چرخِ نیلی پر زیبایش کے لئے سونے کی کیلوں کے بجائے سورج سے بھی بڑے بڑے آتشیں گولے نظر آنے لگے۔ حضرت انسان کو گمان تھا کہ وہ دوسرے جانداروں سے ایک مخلوق ہے۔ مگر نظریۂ ارتقاء کی صداقت نے ثابت کر یہ سب وہم ہے۔ غرض کہ علوم کی ترقی نے انسانی ذہنیت کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ یہ نئی ذہنیت ایک نئے فلسفہ کی صورت میں فروغ پانے لگی۔ آج اس فلسفہ کو ہم عقلیت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

عقلیت نام ہے اس ذہنیت کا جو بلا استثناء کلّی طور پر عقل کی برتری کو تسلیم کرے اور ایسے فلسفہ و اخلاقیات کو تشکیل دے، جو عقل کی کسوٹی پر کسا جا سکے اور ہر طرح کے خیالی مفروضات سے مبرّا ہو۔ عقلیت ایک طریقہ ہے جو ہر چیز کا ٹھوس تجزیہ کرکے اس کی صحیح قدر معلوم کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقلیت، فلسفہ ہے زندگی کا اور فلسفۂ زندگی کی حیثیت سے عقلیت زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے مگر یہ دوسرے فلسفوں کی طرح چند مخصوص نظریوں کا مجموعہ نہیں بلکہ بدلتی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں بدلتی ہوئی چیزوں کی قدر معلوم کرنے کی کسوٹی ہے۔

یوں تو ہر شخص سوچتا اور سمجھتا ہے۔ کم و بیش اپنی عقل کا استعمال بھی کرتا ہے۔ مگر سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عقلیت پسند، زندگی کے مسئلوں کی ہر گتھی کو عقل کے ناخنوں سے سلجھاتا اور عقل ہی کی روشنی میں ہر چیز کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگر اُس کے خیالات یا نتیجے غلط ثابت ہوں تو وہ اُنھیں تبدیل کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اُس کے نزدیک سچائی سے بڑھکر کوئی سند نہیں۔ مگر وہ شخص جو کسی نتیجہ یا فرقہ کا پابند ہے، جس کی ذہنیت چند مخصوص اعتقادات تک محدود ہے لازمی طور پر اپنی عقل کی وسعت اور دائرۂ عمل کو تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اُس کے اعتقادات غلط ثابت ہوں تو بھی وہ نہ اُنھیں چھوڑ سکتا ہے اور نہ چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمانہ کے انقلاب سے پیدا شدہ نئے حالات کے زیر اثر وہ خود کو نہیں بدل سکتا وہ ہر چیز کو اپنے تنگ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر معنی اور حقیقت کو نہایت بے رحمی سے توڑ مروڑ کر اپنے فرسودہ اعتقادوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے خواہ اس میں انصاف اور سچائی ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔

عقیدہ سے ہماری مراد کسی ایسے دعوے سے ہے جس کی تائید میں نہ کوئی ثبوت ہو اور نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ کی ضرورت سمجھی گئی ہو بلکہ اس میں دھمکی دینا کافی سمجھا جاتا ہو۔ مثلاً فلاں بات نہ ماننے سے گناہ ہوگا یا جہنم میں بھیجے جاؤ گے یا سماج سے خارج کر دئے جاؤ گے وغیرہ۔

مذہب کی بنیاد کسی الہامی کتاب یا کسی ایسے شخص کے اقوال پر ہوتی ہے جو مافوق الفطرت خصوصیات رکھتا ہے۔ مذہب ہمارے سامنے چند دعوے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم ان پر یقین کریں، - ناچیز عقل اور شیطانی سائنس کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی اجازت نہیں۔

نت نئی دریافتوں اور معلومات کے اضافہ سے ہمارا علم لگاتار ترقی کر رہا ہے۔ موجوداتِ عالم کے بارے میں جتنی معلومات آج ہمیں حاصل ہیں اُتنی کبھی نہ تھیں چنانچہ ہمارے خیالات اور نظریوں میں موجودہ علم کے مطابق بڑی حد تک ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور آئندہ بھی علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ خیالات اور نظرئے بدلتے رہیں گے۔ مگر مذہبی اعتقادات کبھی نہیں بدلتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار جو مذہبی قوانین بتا دئے مذہب کے خیال میں وہ ہر مقام۔ ہر قوم اور ہر حالت میں یکساں کارآمد ہیں۔ برخلاف اس کے عقلیت کسی عقیدہ کی حامل نہیں، عقلیت پسند موجوداتِ عالم کے متعلق اپنے خیالات کو علم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اپنے اخلاق اور اعمال میں سماج کی ذہنی۔ اخلاقی اور جسمانی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق ترمیم کر لیتا ہے۔ کوئی عقیدہ، رسم و رواج یا روایت خواہ کتنی پرانی کیوں نہ ہو اُسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عقلیت، مذہب کے خلاف ہے کیونکہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ عقلیت ہر اُس خیال اور رسم و رواج کی مخالف ہے جو معقولیت سے خالی ہے اور انسانیت کے حق میں نقصان دہ ہے۔ مگر پھر بھی محض مذہبی احکام کے زیر اثر یا اُن کی قدامت کے باعث مانا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر اہلِ ہند کے ذات پات کے مذہبی سماجی نظام کو لیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان پیدائش ہی سے اچھا یا بُرا، اعلےٰ یا ادنےٰ ہوتا ہے۔ بڑی ذاتیں چار ہیں۔ برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ اور شودر۔ برہمن سب سے اعلےٰ سمجھے جاتے ہیں اُن کی تعظیم اور بیروی دیگر سب ذاتوں پر فرض ہے۔ اس نظام میں شودر کا درجہ سب سے نیچا ہے۔ اُس کی قسمت میں اونچی ذات والوں کی خدمت کرنا ہی لکھا ہے وہ اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتا اونچی ذات والوں سے ہمسری کی خواہش تک اُس کے حق میں موت کا پیغام ہو سکتی ہے۔ اسی ذات پات کے بندھن کے باعث کروڑوں انسان جہالت، غربت اور ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انسانیت سوز اور آمرانہ سماجی نظام مذہب کی سرپرستی میں قایم کیا گیا تھا۔ مذہب نے کہا ابتدا میں برہمن برہما کے تنہ سے نکلے۔ کھشتری بازوؤں سے ویش پیٹ میں سے شودر پاؤں سے پیدا ہوئے، چنانچہ اسی تناسب سے برہمن سب سے اونچے اور شودر سب سے نیچے سمجھے گئے۔ اس غلامانہ نظام کو قایم رکھنے کے لئے دو اعتقاد گھڑے گئے ایک مسئلہ آواگون اور دوسرا کرم کا قانون۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہر جاندار مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز ہر شخص کی موجودہ حالت اور ذات اس کے پچھلے اعمال پر منحصر ہے۔ یعنی اگر اُس نے پچھلی زندگی میں ہندو مذہب کے مطابق نیک اعمال کئے ہیں تو وہ اس زندگی میں برہمن یا دوسری اونچی ذاتوں میں پیدا ہوگا اور اگر بُرے اعمال کئے تو شودر بنے گا۔ صدیوں پہلے فاتح آریوں ہی نے ذات پات کے نظام کو ہندوستان کے مفتوح باشندوں پر لادا تھا۔ اور اُن میں سے اکثر کو نیچ ذات یا شودر قرار دیا تاکہ وہ بدیسی حاکموں کی خدمت کرتے رہیں۔ زمانہ بدلا، آقا خود دوسروں کے غلام بن گئے، مگر اس وقت تک ذات پات کا عقیدہ عوام کے مذہب کا جزو بنکر اُن کی ذہنیتوں پر چھا چکا تھا۔ وہ لکیر کے فقیر بن چکے تھے برہمنوں کی مذہبی حکومت کے قدم جم چکے تھے۔ آج بیسویں صدی میں بعہد جمہوریت میں جب ہم مساوات، اخوت اور آزادی کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں۔ آج جب ہم کہتے کہتے کہ ہر شخص کو زندہ رہنے اور سماج کی مشترک دولت میں حصہ داری کا حق حاصل ہے۔ یہی ذات پات والے ہماری قومی اور سماجی ترقی کی راہ میں کانٹا بنے ہوئے ہیں آج بھی وہ عہدِ جاگیرداری کے خواب دیکھتے ہیں۔ اُن پر اس چیز کا اتنا اثر ہے ان کا آزادی کا تخیل اور معیاری حکومت کا تصور رام راج تک محدود ہے۔ رام راج کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداری۔ اُمرا شاہی۔ غلامی ذات پات کی غیر فطری و انسانیت سوز تقسیم اور عورتوں پر ظلم کے سوا وہ کچھ بھی نہ تھا۔

ہمارے سیاسی معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ ان پیچیدہ مسئلوں کو عقل اور حقیقت کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے ہم ایسے لوگوں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل رہے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ضرورت وقت کیا ہے۔ ایک وہ ہیں کہ قوم اور ملک کی قسمت کو ست اور اہنسا کے تجربات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں انھیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اگر اُن کا تجربہ ناکامیاب رہا تو ملک کا کیا حشر ہوگا ان کے نزدیک ست اور اہنسا مقصود کو حاصل کرنے کے ذرایع نہیں بلکہ خود مقصود ہیں۔ اسی ذہنیت کے باعث ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی قومی جماعت کی بجائے بھگتوں اور چیلوں کی بھجن منڈلی بنی ہوئی ہے اور دوسرے ہیں کہ عوام کی فرقہ وارانہ ذہنیت کو اُکسا کر اپنی شہرت اور منفعت کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ کہیں پاکستان کی طیاریاں ہیں تو کہیں رام راج کی صدائیں آ رہی ہیں۔ غرضکہ حقیقت بینی اور عقل کے استعمال کے بجائے فرسودہ اعتقادات اور جذبات کی رو میں بہکر ہم زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانا چاہتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ عقلِ انسانی سود و زیاں سے بری نہیں اس لئے اس پر کامل بھروسہ رکھنے سے ممکن ہے کہ یہ ہمیں غلط راستہ پر لیجائے۔ عقل اور منطق سے انسان

جو چاہے ثابت کر دکھاتا ہے - عدالتوں میں وکلاء انہی کے سہارے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں - اس لئے عقل کے ذریعہ ہم کسی شئے کے متعلق یکساں نتیجہ پر بھی نہیں پہونچتے - اس کے علاوہ خشک اور بے رنگ منطق و عقل کی پیروی بھی تو زندگی کا واحد مقصد نہیں ہو سکتی - احساسات اور جذبات کی رنگینی انسانی زندگی پر ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی ہے - انسانی مزاج میں پسند ناپسند - محبت نفرت اور روپ رنگ کی دلفریبی کو بہت بڑا دخل حاصل ہے - تصوف و عرفاں کی مہمل اور معقولیت سے خالی باتیں اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں - انسان نے انہی جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر بارہا ایسے اشرف اور نمایاں کام کئے ہیں جو ان کے بغیر ممکن نہ تھے -

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری قوتِ ادراک و فہم خطا کر سکتی ہے - مگر اس کے باوجود یہی وہ وقت ہے جس کے مناسب استعمال سے ہم ہر چیز کی حقیقت معلوم کر سکتے ہیں - عقل ہی انسان کی سب سے بڑی ذہنی قوت ہے - عقل ہی بُرے بھلے کی تمیز کرتی ہے - رہا ادراک و فہم کی غلطیوں کا سوال تو اس کے جواب میں ہم دو باتیں کہیں گے - اول یہ کہ ہمارے سوچنے سمجھنے میں جو عام غلطیاں ہوتی ہیں اگر ہم اُن کی وجوہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل کی کسی کمزوری یا نقص کے باعث نہیں بلکہ ہمارے تعصبات یا ذاتی رجحانات یا جذباتی ہیجان کے عقل و فہم پر غالب آجانے سے ہوتی ہیں - ایسی غلطیوں سے بچنے کے لئے نہ صرف یہی ضروری ہے کہ ہم صحیح اور درست طریقہ پر کسی چیز کے بارے میں سوچیں بلکہ جہاں تک ہو سکے اخذ کردہ نتائج پر ذاتی تعصبات اور رجحانات کا اثر نہ ہونے دیں دوئم صرف عقل ہی میں یہ غیر معمولی استعداد ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو خود صحیح کر لیتی ہے اپنے افعال کی خود تنقید و تنظیم کرتی ہے - یہ اوصاف ہماری کسی اور ذہنی قوت میں نہیں پائے جاتے - مثال کے طور پر عقیدتمندی کو لے لیجئے - وہ لوگ جو عقل کو ہیچ سمجھتے ہیں اکثر کہا کرتے ہیں کہ جہاں عقل کی رسائی نہیں وہاں ایمان لیجاتا ہے - اس لئے ایمان زیادہ قابل اعتبار ہے - بلاشبہ ایمان سے ان کا مطلب مذہبی عقاید سے ہے - مگر تعجب تو یہ ہے کہ مذاہب بھی کسی بات میں ہمخیال اور متفق نہیں - مختلف مذاہب اپنے پیروؤں کو مختلف باتوں پر عقیدہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں بعض اوقات ایک مذہب کے عقیدے دوسرے کے عقیدوں سے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل متضاد ہوتے ہیں - دونوں مذاہب خدائی مگر احکام ایک دوسرے کے قطعی خلاف!

کہا جاتا ہے کہ عقلیت پسند بھی تو کسی نہ کسی چیز پر یقین رکھتے ہیں - مثال کے طور پر سائنسدانوں پر، کیونکہ علم کا خزانہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص ہر بات کا علم بذات خود حاصل نہیں کر سکتا اس لئے بہت سی باتوں میں سائنسدانوں اور عالموں کے اقوال کا اعتبار کرنا پڑتا ہے - مگر سائنسدانوں پر یقین رکھنا جن کی ہر بات کی تصدیق ہو سکتی ہے ایسے شخص یا کتاب پر ایمان لانے سے بالکل مختلف ہے کہ جس کے دعوؤں کی کسی صورت بھی تصدیق نہیں ہو سکتی - کسی علمی سچائی کو ہم عقیدۂ محض نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی شخص یا سائنسداں کی صرف سند یا قول پر ہی ہم اسے ماننے کے لئے مجبور نہیں - دوئم ہر علمی اور سائنٹفک سچائی کی مشاہدہ تجربہ اور استخراج سے تصدیق ہو سکتی ہے اس کے برعکس کسی عقیدہ پر بلا کسی ثبوت کے یقین رکھنا ضروری ہے -

اگر کبھی ہم اپنے خیالات پر ایک تنقیدانہ نظر ڈالیں تو ایسی باتوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ جائیں گے، جنھیں ہم بلا حجت آنکھیں بند کئے مانتے چلے آئے ہیں - جنکی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی صحیح دلیل یا ثبوت نہیں - زیادہ تر ہمارے خیالات اور اعتقادات دوسروں کی ایما سے بنتے ہیں جنھیں ہم اپنی ذہنیت کا جزو بنا لیتے ہیں - کسی نے، کسی جگہ، کسی وقت کسی بات کا اظہار کیا اور ہم نے اسے اعتقاداً مان لیا - عام طور پر دوسروں کے خیالات کا اثر بچپن میں ہوتا ہے جبکہ سوچنے سمجھنے کی قوت کمزور ہوتی ہے بعد میں ہم ان خیالات سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ ان کی سچائی میں شُبہ بھی محال ہوتا ہے - ہمیں اُن کی صداقت عیاں نظر آتی ہے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شبہ کرنا بھی بیہودہ پن میں شامل ہوگا -

لیکن اگر کسی کٹر سے کٹر مسلمان اور ایک پکے سے پکے ہندو کو جبکہ وہ دودھ پیتے بچے تھے بدلکر مسلمان کو ہندو گھرانے میں رکھا جاتا اور ہندو کو خالص اسلامی ماحول میں پلنے دیا جاتا تو اس میں قطعی شُبہ نہیں کہ آج اُن کے خیالات اور اعتقادات یہ نہ ہوتے جو اب ہیں اور اُس حالت میں بھی ہر ایک اپنے خیالات کی صداقت میں اتنا ہی یقین رکھتا جتنا کہ وہ آج مخالفت میں رکھتا ہے یہی چیز مذہبی اعتقادات کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی صحیح ہے - اگر ہم ایسے سماج یا فرقہ میں پیدا ہوتے جہاں دخترکشی یا آدم خوری رائج ہے تو ہمیں بھی اس ماحول میں پرورش پانے سے وہ باتیں قدرتی جائز نظر آتیں - اگر ہماری پرورش شہر کے جرائم پیشہ طبقہ میں ہوتی تو ہمارا اخلاقی معیار یہ نہ ہوتا جو اب ہے - اسی طرح کسی انگریز بچہ کو جرمن گھر میں رکھا جائے اور اُسے اس کا علم نہ ہونے دیا جائے کہ اُس کے والدین انگریز تھے تو بالغ ہونے پر بھی اُس کے جذبات اور احساسات جرمن قوم اور ملک سے وابستہ رہیں گے - جرمنوں کی طرح اسے بھی تمام انگریز غیر قوم اور دشمن نظر آئیں - ہمارے اعتقادات اور خیالات ---

ہمارے بعض نہایت گہرے اور بنیادی عقیدے ــــ اُس ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ اس لئے ایمان کو عقل کا بدل تصور کرنا غلطی ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جب تک انسانی دماغ کی بناوٹ ایسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے تب تک انسانی زندگی کے ڈرامہ میں جذبات اور احساسات ہمیشہ ایک اہم پارٹ ادا کرتے رہیں گے بلاشبہ انسان کے بعض نہایت اعلیٰ اور اشرف کارنامے انہی کے اثرات کی پیداوار ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ قبیح سے قبیح خیال کا مرتکب بھی انہی کے زیر اثر ہوا ہے۔

مانا کہ روایتیں اور رسم و رواج کسی عہد کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی اُس زمانہ کی خرابیوں اور برائیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں اس لئے قدیم رسم و رواج اور روایات کے بیشتر حصہ کی موجودہ زمانہ میں بہت کم اہمیت رہ گئی ہے۔ کیونکہ انقلابات زمانہ نے انسانی ماحول کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ انسان کے شخصی معاشی اور سیاسی تعلقات میں ایک انقلاب عظیم برپا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے زمانہ میں علم و سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کا عملی تجربہ اور موجودہ زمانہ کا وسیع علم دونوں ہمارے پاس ہیں اس لئے آج بدلے ہوئے حالات میں بھی ہر بات میں قدما کے قول کو سند ماننا صحیح نہیں۔ سماج کی صحیح معنوں میں ہم اسی حالت میں خدمت کر سکتے ہیں اگر ہم ماضی کا مطالعہ زمانۂ حال کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کریں۔

اخلاق کا عقلی نظریہ یہ ہے کہ کوئی فعل جتنا سماج اور فرد کے لئے مفید ہے اُتنا ہی پُر اخلاق ہے۔ با اخلاق وہ ہے جو حتی الامکان ایک منظم سماج کو تشکیل دینے اور بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے اور ہر اُس فعل سے پرہیز کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے کہ اُس کے یا سماج کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ہمارے ملک کو عقلی ذہنیت کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہماری بہت سی اُلجھنوں اور گتھیوں کو سلجھا دے گی جن کا ہم آج تک کوئی حل تلاش نہ کر سکے مثال کے طور پر ہمارے مذہبی تفرقات اور تعصبات جو ہمارے لئے وبالِ جان ہیں عقلیت کے زیر اثر رواداری اور آزاد خیالی کی رَو میں بہ جائیں۔ ہمارے سیاسی مسئلہ بھی عقل و فہم کی روشنی میں بخوبی حل ہو سکتے ہیں جذبات کی فراوانی سے نہیں۔ فرقہ پرست۔ متعصب اور رجعت پسند راہنمایانِ قوم کی راہنمائی سے نہیں۔ وہ ملک یا قوم جو اپنی عقل کا استعمال نہیں کر سکتی جس کی مشعلِ راہ قدامت پرستی اور کورانہ تقلید ہو تہذیب اور ترقی کی ہمیشہ پچھلی صفوں میں رہے گی۔

ہمارے وسیع ملک کی اکثریت افلاس۔ بیماری اور جہالت کے خوفناک غاروں میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ قوم جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے ذات پات اور فرقوں کی غیر فطری زنجیروں میں بندھی مذہبی ریاکاری۔ توہم پرستی اور مختلف اقسام کے استحصالات کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ہماری آیندہ ترقی کا راز زندگی کے ہر شعبہ میں سائنس اور عقل کے استعمال میں پنہاں ہے۔

ڈاکٹر پریم ناتھ

نگار کے پچھلے پرچے

(۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (۲۷ء) اگست عہ ر۔ (۳۰ء) مئی عہ ر۔ (۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (۳۲ء) جنوری عار۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ رفی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (۳۳ء)۔ فروری عہ ر۔ (۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ رفی پرچہ۔ (۳۶ء) دسمبر عہ ر۔ (۳۷ء) جنوری عار فروری عہ ر، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ رفی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (۳۸ء) جنوری ۷ ر۔ فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ رفی پرچہ۔ (۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ رفی پرچہ، ستمبر عہ ر، اکتوبر، نومبر ۸ رفی پرچہ۔ (۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ رفی پرچہ، جولائی و اگست عہ رفی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ رفی پرچہ۔ (۴۱ء) جنوری فروری عار۔ مارچ تا دسمبر ۶ رفی پرچہ۔ (۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ رفی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

ابدی طاقت

صوفی کا تصور :-

کون ہے :- جس نے کیا عالمِ امکاں تخلیق
جامِ کونین میں کیا ہے - یہ چھلکتی ہوئی مے
انجمستاں کی فضا میں یہ کشش ہے کیسی
کون ہے یہ جو خراماں ہے چمن زاروں پر
بجلیوں میں یہ تب و تابِ نظر ہے کس کی
لالۂ و گل میں بھڑکتے ہوئے شعلے کیا ہیں،
عالمِ عشق میں ہے کس کا خرامِ رنگیں،
کس کی تصویر ہے یہ دل کے صنمخانے میں
جامِ رنگیں میں یہ مستانہ ادا ہے کس کی
کس کے آئینۂ ہستی کا ہے ادراک و نمود
ہائے یہ حُسن و جوانی کی متاعِ ابدی
لامکاں کی یہ فضائیں - یہ نظر کی پرواز
میرے احساس میں یہ جذبِ نہاں - سوزِ دروں
ہو نہ ہو کوئی زیارت کدۂ دل ہے ضرور
"کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستم کاری میں

کس کے احساس نے بخشی ہے نگاہِ تحقیق،
تیرتی ہے یہ فضائے ابدی میں کیا شے
دلِ خورشید میں آخر یہ تپش ہے کیسی
دبدبہ کس کا ہے - چھایا ہوا کہساروں پر
مسکراتی ہوئی یہ شام و سحر ہے کس کی
سطحِ دریا پہ مچلتے ہوئے نغمے کیا ہیں
حُسن ہے کس کی تجلّی کا پیامِ رنگیں
یہ مئے ناب ہے کیا عقل کے پیمانے میں
لبِ منصور پہ آخر یہ صدا ہے کس کی
یہ امڈتا ہوا طوفاں - یہ کہستاں کا جمود
ہائے یہ مہرِ درخشاں - یہ شعاعِ ابدی
عالمِ شوق و تمنّا کا یہ سربستہ راز،
دل کی دنیا میں یہ ہیجان - یہ شورش - یہ جنوں،
انھیں موجوں میں کوئی دامنِ ساحل ہے ضرور
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

سرمایہ دار کا تصور :-

کس کے جلووں سے یہ شہروں کی فضا ہے معمور
تاجِ سلطاں میں یہ تابش، یہ جھلک ہے کس کی
شمعِ تہذیب میں یہ سوزِ دروں ہے کس کا
فیض سے کس کے یہ دولت ہے سزاوار مجھے

کون برساتا ہے محلوں کے در و بام پہ نور،
اِن دمکتے ہوئے سکوں میں چمک ہے کس کی
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ فسوں ہے کس کا
کس کی رحمت نے بنایا ہے گنہگار مجھے

معرفت کس کی سکھاتے ہیں یہ پیمانۂ و خُم
محفلِ عیش میں نوروز ہے کیا۔ عید ہے کیا
کس کی تقدیس سے روشن ہیں عبادت گاہیں
کس کی عظمت ہے یہ مسجد کے مناروں سے عیاں
کس نے سونپی ہے یہ قارون کی دولت مجھ کو
کس کا مظہر ہے یہ طوفانِ حوادث کا جلال
حکم سے کس کے ہے یہ معرکۂ سود و زیاں،
ہو نہ ہو یہ کوئی معبودِ حقیقی ہے ضرور
جو لٹاتا ہے زر و سیم و گہر میرے لئے
کیف سے جس کے ہے معمور دو عالم کا ایاغ

غریب کا تصور :—

کس نے بھیجا ہے : طوفان۔ یہ سیلابِ عظیم
قہر ہے کس کا، سمندر کا اُبلتا ہوا جھاگ
اس کڑکتی ہوئی بجلی میں غضب ہے کس کا
آگ ہے کس کی یہ جنگل کے چناروں میں نہاں
کس نے فردوسِ تمنّا کی مجھے دی ہے خلش
کس کی آنکھوں میں ہے یہ میری تمناؤں کا خوں
سینۂ بحر پہ یہ دیو کے مانند جہاز
کوئی بتلائے کہ یہ زیرِ نگیں ہیں کس کے
کارخانوں کی یہ چمنی۔ یہ دھوئیں کے بادل
یہ فضاؤں میں اڈتا ہوا سیلاب خیال
زندگی موت کی آغوش میں پر تولے ہوئے
کس کی جانب ہیں، واں یہ مری قسمت کے سفیر
کتنا تاریک ہے دُنیا کے تصور کا مآل،
میری تخئیل میں یزداں بھی ہے۔ ابلیس بھی ہے

کس کی قدرت کا ہے شہکار یہ ماہ و انجم
حرم و دیر میں یہ نغمۂ توحید ہے کیا
کس نے کھولی ہیں نجاتِ ابدی کی راہیں
کس کے شعلے ہیں کلیسا کے شراروں سے عیاں
کس نے بخشی ہے یہ تقدیر کی جنّت مجھ کو
کس کے ہاتھوں میں ہے قوموں کا عروج اور زوال
کس کی ابرو میں لچکتی ہے معیشت کی کماں
عادلِ کون و مکاں۔ خالقِ ہستی ہے ضرور
بخشتا ہے جو دعاؤں میں اثر میرے لئے
جس کی تنویر سے روشن ہیں مذاہب کے چراغ

کون ہے قحط کی دنیا کا خداوندِ کریم،
کون برساتا ہے سورج سے دہکتی ہوئی آگ
یہ گرجتا ہوا طوفان سبب ہے کس کا
کس کے قبضے میں ہے بپھری ہوئی موجوں کی عناں
کس نے بھر دی مری ہستی میں قیامت کی تپش،
کس کی بیرحم مشیّت ہے مرا حالِ زبوں،
زرپرستوں کے یہ محمود۔ حکومت کے ایاز
راز داں کس کے ہیں۔ جبریلِ امیں ہیں کس کے
چشمِ افلاک میں پھیلا ہوا جیسے کاجل
شعلۂ زیست میں یہ حلقۂ گرداب خیال
آندھیاں بڑھتی ہوئیں۔ زلزلے منھ کھولے ہوئے
کس کے ہاتھوں میں ہے یہ موجِ ہوا کی زنجیر
کتنا عفریت کے سایوں سے لرزتا ہے خیال
اہرمن زار بھی ہے۔ گلشنِ تقدیس بھی ہے

میری پستی نے بنائے ہیں ہزاروں مسجود
ایسے معبود کہ ہے جن کا تصور بھی محال
دیوتاؤں کو مگر پھر بھی مری فکر نہیں
داستانِ غمِ دل جا کے سناؤں کس کو
اُف یہ تپتا ہوا دن اور جھلستی ہوئی رات،
ہائے مٹتی ہوئی صورت یہ شبستانوں کی،
کتنا دلدوز ہے یہ رات کا پر ہول سماں،
کوئی دمساز۔ کوئی راہنما ہے کہ نہیں

وہم نے میرے تراشے ہیں ہزاروں معبود،
ایسے خالق کہ زمانے میں نہیں جن کی مثال
بزمِ افلاک میں افسوس مرا ذکر نہیں
داغِ دریوزہ گری آہ دکھاؤں کس کو
موت کے خواب میں کھوئی ہوئی تعبیرِ حیات
یہ اُجڑتی ہوئی دنیا مرے ارمانوں کی،
نہ کوئی شمعِ سرِ راہ۔ نہ منزل کا نشاں
سوچتا ہوں کوئی میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

مسعود اختر جمال

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدّہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ سوڈان۔ جدّہ اور سویز تک
مسافر اور مال واسباب لے جاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارلیسن۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

ستاروں کی پیمایش اور انکا وزن

وہ لوگ جو فلکیات کی ریاضی سے واقف نہیں ہیں، انھیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی ستارے کا وزن یا اس کی پیمایش بیٹھے بیٹھے جان لی جائے اور اسی لئے جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین کا وزن اتنا ہے، مشتری اتنی دور واقع ہے، یا سورج کا رقبہ اتنا ہے، تو وہ ہنستے ہیں کہ یہ سب لغو قیاس آرائی ہے اور صحت و حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن جو لوگ اس فن کے جاننے والے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں صحیح ہے اور اتنا صحیح ہے جیسے دو اور دو چار۔

آیئے آج کی صحبت میں ہم بھی غور کریں کہ کیا ان لوگوں کا کہنا واقعی درست ہے اور وہ کیا اُصول ہیں جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ کہا کرتے ہیں۔

اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ساری کائنات میں اصول کشش جاری و ساری ہے، یعنی فضائے بسیط کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اس زنجیر سے جکڑا ہوا نہ ہو۔ چاند کا مقررہ وقت سے مقررہ دوری پر گردش کرتے رہنا، سیاروں کا ایک خاص دائرہ میں چکر لگانا، سمندروں میں مدوجزر پیدا ہونا، یہ سب قوتِ کشش ہی کا نتیجہ ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہی وہ کشش تھی جس نے اربوں سال پہلے کرۂ آفتاب سے اس کے ایک حصّہ کو جدا کر کے ہماری زمین کو پیدا کیا اور یہی وہ کشش ہے جو اُسے آفتاب کے دائرۂ حرارت کے اندر رکھتی ہے، ورنہ یہ فضائے بسیط کے کسی برفانی عمق میں خدا جانے کب غائب ہو گئی ہوتی اور جاندار کے وجود سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی۔

اب آیئے قوتِ کشش کو سمجھیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ سے اگر کہا جائے کہ دس من کا پتھر اُٹھایئے تو آپ نہ اُٹھا سکیں گے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہم اس کشش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ آپ کرکیٹ کے گیند کو پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی چند گزوں سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتے محض اس لئے کہ زمین کی کشش اسے دور نہیں جانے دیتی۔ اگر یہ کشش مزاحم نہ ہو تو وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے اور ایک سال کے بعد فضا میں ۵۰۰، ۷ میل آپ سے دور ہو جائے۔ چاند ہی کو لیجئے کہ ہمارے سروں پر ۲۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، لیکن اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچے تو ایک سال کے اندر وہ فضا میں ہم سے دو کروڑ میل دور ہو جائے۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کشش کیا چیز ہے اور نظام کائنات میں اسے کتنا دخل ہے، پھر اس کشش کا تفصیلی مطالعہ صرف زمین کی انسانی تجربہ گاہوں ہی میں نہیں ہو سکتا، بلکہ قدرت کے اس وسیع تجربہ گاہ میں بھی ہوتا ہے جسے فضائے بسیط کہتے ہیں اور جہاں بڑے بڑے گُرے رات دن گردش کیا کرتے ہیں۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جسم جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی زیادہ کشش اس میں پائی جائے گی۔ چونکہ زمین سے بڑی چیز کوئی اور ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے ہم کو زیادہ تر اسی کی کشش سے واسطہ پڑتا ہے اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کشش کا علم ہمیں نہیں ہوتا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے حقیر سے حقیر ذرہ میں قوت کشش پائی جاتی ہے۔ ایک دوسری بات اور بھی ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ جب دو جسم ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو مقدارِ کشش دونوں کی ایک ہوتی ہے، لیکن ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔

ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، اس کے معنے یہ ہیں کہ زمین نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا، لیکن چونکہ سیب زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اس لئے ہم یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود اس کی قوت کشش کا زمین پر کیا اثر ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان قوت کشش کا انحصار بہت کچھ مادہ کی مقدار پر ہوا کرتا ہے، مادہ کی نوعیت پر نہیں۔ اسی لئے زمین کی قوت کشش جتنی ایک من سیسہ پر صرف ہوتی ہے اتنی ہی ایک من روئی پر، ورنہ دنیا کا تمام تجارتی کاروبار درہم برہم ہو جائے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھئے:۔

آپ بازار جاتے ہیں اور دوکاندار سے ایک پونڈ چاء خریدتے ہیں، وہ ترازو کے ایک پلڑے میں پونڈ کا باٹ رکھتا ہے، دوسرے میں چاء اور جس وقت دونوں پلڑے برابر ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ چاء کا وزن پورا ہو گیا۔ آپ نے شاید غور نہ کیا ہوگا کہ وزن جس چیز کا نام ہے وہ صرف زمین کی کشش ہے، یعنی ترازو میں چیز کو

وزن نہیں کیا جاتا بلکہ زمین کی کشش کا اندازہ کیا جاتا ہے اور چونکہ زمین کی کشش ہر مادہ کی ایک معین مقدار پر یکساں کام کرتی ہے اس لئے ایک پلڑے میں باٹ اور دوسرے میں چار دونوں پر اس نے یکساں کام کیا اور جب دونوں پلڑوں پر کشش برابر ہوگئی تو سمجھ لیا گیا کہ دونوں کا وزن برابر ہے۔

کشش کے ان چند ابتدائی اُصول کے سمجھنے کے بعد آپ کو یہ سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ سیاروں کا وزن کیونکر معلوم کیا جاتا ہے۔

زمین کا وزن

اگر ہم دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں تو فاصلہ کی مقدار سے ان کی باہمی کشش بھی کم ہو جائے گی۔ لیکن فاصلہ اور کشش میں کیا تناسب ہے، اس کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا۔ ماہرین نے تجربات سے اس کو بھی متعین کر لیا ہے اور وہ بتا سکتے ہیں کہ اگر ایک ہی وزن کی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے دور کیا جائے تو دوری کے لحاظ سے باہمی کشش میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ انھوں نے مختلف اوزان کی چیزوں کے درمیان بھی فاصلہ و کشش کے تناسب کو معلوم کر لیا ہے اور اس طرح زمین کی اس کشش کا اندازہ کر کے جو ایک من سیسہ ایک گیند یا چاند پر صرف ہوتا ہے، انھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ زمین کا وزن تقریباً ۶۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن ہے

آفتاب کا وزن

جس طرح ہم زمین اور چاند کی کشش سے زمین کا وزن معلوم کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم آفتاب کی کشش سے جو نظام شمسی کے تمام سیاروں پر صرف ہوتی ہے خود اس کا وزن بھی جان سکتے ہیں اور اسی بنا پر ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ آفتاب کا وزن زمین سے ۳۳۲۰۰۰ گنا زیادہ ہے، گویا ہر اونس حصۂ زمین کے مقابلہ میں آفتاب ۹ ٹن سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

چونکہ آفتاب کا وزن بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی قوت کشش بھی اتنی ہی بڑھی ہوئی ہے۔ ہم زمین پر کئی کئی من کا وزن اُٹھا لیتے ہیں اور گیند کو کافی دور تک پھینک سکتے ہیں، لیکن آفتاب کی سطح پر مضبوط سے مضبوط آدمی بھی سات پونڈ کا وزن نہیں اُٹھا سکتا اور گیند دو تین گز سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتا۔ اور یہ بھی اُس صورت میں ممکن ہے جب آدمی فولاد کا بنا ہو ورنہ یونہی وہ خود اپنے ہی وزن سے پسکر رہ جائے گا۔

پھر جس طرح آفتاب کی کشش نظام شمسی کے تمام سیاروں پر کام کر رہی ہے، اسی طرح ان سیاروں کی کشش بھی چھوٹے چھوٹے اجسام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیارۂ مشتری کے مطالعہ سے اس کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔

ہر اُس شخص کو جسے فلکیات سے دلچسپی ہے، یہ بات معلوم ہوگی کہ مشتری کے نو چاند ہیں۔ یعنی جس طرح زمین کا ایک حصہ اُس سے جدا ہو کر ایک چاند بن گیا، اسی طرح مشتری نے نو چاند پیدا کئے۔ لیکن اب جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ سات چاند تو بیشک اس سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن دو ایسے ہیں جو اپنی کشش کی بدولت اس نے فضا سے حاصل کئے ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان دو کی گردش دوسرے سات چاندوں سے مختلف ہے، وہ مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتے ہیں اور یہ شمال سے جنوب سے شمال کی طرف۔ زحل اور عطارد میں بھی ایک ایک چاند اسی طرح کا نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آفتاب کی طرح دوسرے سیارے بھی چھوٹے اجسام کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔

نظام شمسی کے بعید ترین سیاروں کا اکتشاف

ایک صدی قبل نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ یورانوس سمجھا جاتا تھا، لیکن ماہرین نے دیکھا کہ آفتاب اور یورانوس کی باہمی کشش کے لحاظ سے جو راستہ یورانوس کی گردش کا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہے اور انھیں خیال ہوا کہ ممکن ہے بعض اور سیاروں کی کشش اس راستہ سے ہٹا دیتی ہو، چنانچہ پندرہ سال کی تحقیق و جستجو کے بعد ۱۹۳۰ء میں معلوم ہوا کہ واقعی ایک سیارہ عطارد سے بھی زیادہ دور ایسا ہے جو یورانوس کے دائرۂ رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا نام انھوں نے پلوٹو رکھا۔ یہ بہ نسبت زمین کے ۴۰ گنا زیادہ آفتاب سے دور ہے اور ۲۵۰ سال میں آفتاب کے گرد اپنا دائرہ پورا کرتا ہے۔

دوسرے سیاروں کا وزن

یہاں تک تو صرف ان سیاروں کا ذکر تھا جن کا تعلق ہمارے نظام شمسی سے ہے، لیکن یورانوس اور پلوٹو سے بھی آگے فضا میں بے شمار جھنڈ تاروں کے نظر آتے ہیں اور اُن میں سے بعض اتنے چھوٹے یا اتنی دور ہیں کہ وہ جھنڈ سے علٰحدہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی اُصول کشش کے ماتحت ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گے اور ان کی دُنیا میں بھی قریب قریب وہی حالت پائی جاتی ہوگی جو ہمارے نظام شمسی میں نظر آتی ہے۔

ان جھنڈوں میں ہم سے قریب تر جھنڈ تین ستاروں کا ہے جن میں دو زیادہ روشن اور ایک کم روشن ہے، بعض صرف دو ستاروں کا جھنڈ ہے، لیکن ان سب کی

گردش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قانون کشش کے پابند ہیں اور اس لئے ان کا وزن بھی بڑی حد تک معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماہرین نے ان میں سے بعض سیاروں کا وزن آفتاب سے ایک ہزار گنا زیادہ اور بعض کا ۳۰ گنا زاید دریافت کیا ہے۔

سیاروں کی روشنی

آسمان میں ہم کو بعض ستارے بہت روشن اور بعض بہت دھندلے نظر آتے ہیں، لیکن جس طرح یہ ضروری نہیں کہ زیادہ روشن ستارہ ہم سے زیادہ قریب ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں زیادہ دھندلا ستارہ ہم سے زیادہ دور ہو۔ بعض ستارے واقعی بہت روشن ہیں اور بعض بہت کم۔

تمام اُن ستاروں میں جو ہمیں نظر آتے ہیں، سیریس (Sirius) سب سے زیادہ روشن ستارہ ہے، اسی سے متصل ایک اور ستارہ نظر آتا ہے جو بہت دھندلا ہے، حالانکہ یہ یقیناً زیادہ دور واقع نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ستارہ کی روشنی علٰحدہ علٰحدہ ہے اور ماہرین نے ان کی روشنی کا اندازہ بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے زمین کو لیجئے۔ اس کا فاصلہ سورج سے ۹۲۹۰۰۰۰۰ میل ہے، اور اگر اتنی دوری پر ہمارا کرۂ زمین بھی روشن نظر آتا ہے تو اسے ۳۰۰۰۰۰

ماہرین فلکیات بھی اسی طرح ستاروں کے رنگ سے ان کا درجۂ حرارت معلوم کرتے ہیں۔ جو ستارے سُرخ نظر آتے ہیں وہ نسبتاً کم گرم ہیں اور ان کا درجۂ حرارت ۲۵۵۰ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ نیلے رنگ کے ستاروں کا درجۂ حرارت ان سے دوچند ہوتا ہے، ان کے بعد سفید رنگ کے سیارے ہیں جو آفتاب کا سا درجۂ حرارت (دس ہزار) رکھتے ہیں اور پھر نیلگوں اور بنفشئی رنگ کے سیارے جو بہت زیادہ گرم ہیں اور جن کا درجۂ حرارت ۷۰ ہزار سے کم نہیں۔

ستر ہزار درجۂ حرارت رکھنے والے سیارے غیر معمولی برقی قوت پیدا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی چند مربع گز سطح سے جتنی قوت پیدا ہوتی ہے، اس سے کرۂ زمین کی تمام ریلوں کو چلایا جا سکتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑے جہاز کو چلانے کے لئے صرف ایک مربع انچ سے پیدا ہونے والی قوت کافی ہے۔

ان طریقوں سے سیاروں کی جسامت اور قوت کا جو حال معلوم ہوا ہے وہ بہت حیرتناک ہے۔ آفتاب جسے ہم اس وقت تک بہت بڑا سیارہ سمجھتے تھے اتنا بڑا کہ لاکھوں کرۂ زمین اس میں سما سکتے ہیں وہ اب بہت معمولی سیارہ رہ گیا ہے اور بعض اتنے بڑے سیارے دریافت ہوئے ہیں کہ آفتاب ایسے لاکھوں کُرے اس میں سما سکتے ہیں اور پھر بھی بہت جگہ باقی رہ سکتی ہے، یعنی اگر ہم ان سیاروں کی جسامت موٹر کے برابر فرض کریں تو اس کے مقابلہ میں آفتاب کی جسامت ایک میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی!

اعتبارات!

"بڑھیا تو کیوں رو رہی ہے"۔ "میرا بچہ بیمار ہے۔ جوان اکلوتا بچہ! میری زندگی کا اکیلا سہارا، میرے اُجڑے ہوئے گھر کا تنہا چراغ۔ آہ، وہ بہت بیمار ہے، لوگ کہتے ہیں وہ بچے گا نہیں، سچ بتاؤ، کیا واقعی وہ مر جائے گا"۔

— "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، گھبراؤ نہیں، علاج کرو، اچھا ہو جائے گا"۔

— "علاج! ہاں، علاج تو میں کر چکی جو کچھ کر سکتی تھی۔ اس پھٹی ہوئی دھوتی کے علاوہ جو کچھ تھا سب بیچ کر میں اسکے علاج میں لگا چکی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا"۔

— "پھر اب کہاں جا رہی ہے"۔

— "مسجد جا رہی ہوں، خدا سے التجا کرنے جا رہی ہوں، وہی سُنے گا اور وہی اسکو اچھا کریگا"

— "ضرور جاؤ، خدا میں بڑی قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

چند دن بعد —

— "بڑھیا یہ کیا بک رہی ہے، خدا کی شان میں ایسی گستاخی!"

"خدا! — کون خدا؟ وہی جس نے میرا اکلوتا بچہ مجھ سے چھین لیا، جو رات دن ناک رگڑوانے کے بعد بھی میری خواہش کو پورا نہ کر سکا۔ جو مردوں کو جلانے کی قدرت رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود معمولی کھانسی بخار کو دور نہ کر سکا — ہٹ جاؤ میرے سامنے سے، مجھے نہیں معلوم میں کیا کہہ رہی ہوں، میرے سینہ سے دھواں اُٹھتا ہے۔ مجھے نہ چھیڑو — میرے جسم کی رگ رگ ٹوٹی جا رہی ہے۔ میرا ریشہ ریشہ اینٹھ رہا ہے — جب میرا بیٹا دنیا میں نہ رہا تو میں خدا کو لیکر کیا کروں گی!"

— "بڑھیا، ایسی ناشایستہ باتیں منہ سے نہ نکال، تیرا بیٹا خدا کی امانت تھی، اس نے واپس لیلی، اس میں بُرا ماننے کی کیا بات!"

— "خدا کی امانت تھی! بالکل جھوٹ؟ جب اس کا باپ چھوٹا سا چھوڑ کر مرا تو کیا خدا نے اس کو آکر پالا تھا — کیا جلتی دھوپ میں پتھر توڑ توڑ کر خدا ہی اسکے لئے غذا فراہم کیا کرتا تھا — ہونہہ! — میں نے اپنا خون پلا پلا کر اُسے پالا، میں نے فاقہ کر کر کے اس کا پیٹ بھرا — جب بیمار پڑا تو ساری گھرستی بیچکر میں نے اس کا علاج کیا، رات رات بھر میں اس کے لئے جاگی۔ اس کی صحت کے لئے میلوں پیدل چلکر میں دوا لائی — خدا نے کیا کیا — وہ میرا بیٹا تھا میری چیز تھی۔ امانت کیسی!"

— "معلوم ہوتا ہے تو نے صرف دوا پر بھروسہ کیا۔ خدا سے دعا نہیں کی"۔

— "(چیخ کر) ہٹ جاؤ، دور ہو میرے سامنے سے — میں نے دعا نہیں کی؟ اندھو جاؤ، جا کر دیکھو، مسجد کے فرش پر اب بھی میرے آنسوؤں کے دھبے بہت سے موجود ہوں گے — خدا — خدا، کرتے پھرتے ہیں — جب دعا کرتے وقت میرا سینہ پھٹتا تھا، تو تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے والا نظر نہ آتا تھا اور اب جو میں دعا نہ سننے والے کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں، تو کم سب کائیں کر کے میرے پیچھے پڑے ہو — اگر خدا کسی کی دعا نہیں سُن سکتا، تو اسے بُرا بھلا سننے کے لئے بھی طیار رہنا چاہئے"۔

بڑھیا کو پاگل سمجھ کر لوگ چلے گئے، لیکن میں نے یہ سارا واقعہ ایک بڑے دیندار عالم سے بیان کیا، تو انھوں نے کہا "افسوس ہے اسلامی حکومت نہیں، ورنہ اس بڑھیا کو قتل کر دیا جاتا —"

یہ سنکر میں نے دل ہی دل میں کہا کہ — "بڑھیا کو تو خیر غم نے دیوانہ بنا دیا تھا اور وہ خدا کے صحیح تصور پر قادر نہ تھی لیکن انھیں کیا ہو گیا ہے

خدا اور دار و رسن!

اس امتزاج پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

احسان

چمپا کو ہم ایک ہی پوشاک میں پھرتا ہوا دیکھتے۔ سفید دھوتی، سفید جمپر اور ایک پھٹی سی چپل، یہ تھی اس کی وضع جس میں وہ رات دن دیکھی جاتی۔ مگر اس کے پاس ایک دھوتی اور ایک جمپر اور بھی تھا۔ جب ایک ان میں سے میلا ہو جاتا تو دوسرا جو دھوبی سے دھلا کر بڑی احتیاط سے رکھا ہوا ہوتا نکالتی اور پہنتی!! سال میں صرف ایک دفعہ یا اگر اس کی تقدیر جاگ گئی تو دو مرتبہ نئی دھوتی، نئے جمپر اور نئی چپل پہنے دیکھی جاتی مگر یہ بھی ہوتا تھا۔ جب پہلی چیزیں پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتیں!!

اس سے زیادہ اس کو کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ اس کو خواہش کرنے پر بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچا کرتی کہ شاید میں زیور اور اچھی اچھی ساریاں اپنی قسمت میں لائی ہی نہیں۔ پرماتما نے بھی ہماری قسمتوں میں کتنا فرق رکھا ہے۔ اس کے پڑوسی کے کئی ایک باغ ہیں، گاؤں ہیں، وہ رات دن گھر میں پڑا رہتا ہے اور اس کا کام صرف نوکروں پر حکم چلانا اور غریبوں پر اپنی ہیکڑی جمانا ہے!۔ اور میرے پتا! صبح کو نو یا دس بجے گھر سے نکل جاتے ہیں اور جب تک سورج ڈوب نہیں جاتا، گھر کے اندر قدم نہیں رکھتے۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور تیس دن میں ان کو ملتا کیا ہے؟ — کُل تیس روپئے۔ وہ سوچا کرتی کہ میرے پتا کو دنیا میں سب سے زیادہ روپیہ ملنا چاہئے تھا۔ مگر نہیں یہ دنیا کا قاعدہ نہیں۔ اُس آدمی کو زیادہ روپئے ملتے ہیں جو کم کام کرتے ہیں اور وہ آدمی بھوکوں مرتے ہیں جو کام کرتے ہیں۔

چمپا اور سوچتی "کیا کبھی میری تقدیر بھی پھرے گی۔ کیا میں بھی کبھی زیور پہن سکوں گی؟" مگر وہ سوچتی رہ جاتی!! اور اس کے سوچ کا کچھ اخیر نہ ہوتا! — وہ ٹھنڈی سانس بھرتی اور خاموش لیٹ جاتی۔

پڑوس میں بڑے دھوم دھام سے شادی ہو رہی تھی۔ سنا جا رہا تھا کہ لڑکی کو بہت زیور چڑھا ہے۔ چمپا بھی یہ باتیں کان لگا کر سنتی اور اپنی ماں سے کہتی! — ماں سنتی ہے!۔ کوئی چیز لاکٹ بھی آئی ہے۔ ماں کیا ہوتا ہے لاکٹ؟ سُنا ہے نیک لیس بھی آیا ہے! یہ کیسا ہوتا ہے۔ ماں ہوں ہاں کر کے خاموش رہ جاتی۔

"چمپا کا بیاہ کب کرے گی؟" ایک بڑھیا نے اس سے کہا!

"چمپا کا بیاہ؟ — ہو جاوے گا۔ روپیہ چاہئے؟"

"سُنجھ روپئے کی کیا ضرورت۔ اس کو چاہے کوئی بیاہ لے جائے۔ وہ روپ دنی ہے!!" آج پہلی مرتبہ چمپا کی ماں کو معلوم ہوا کہ روپ ہونا بھی لڑکی کے اندر گُن ہے! آج تک وہ یہی سمجھتی آتی تھی روپیہ ہی بڑا گُن ہے!

"تو بتاؤ اس کے روپ کی قدر کون کرے گا؟"

"دیکھ شیلا کی چاچی آئی ہے۔ ان کے لڑکے کی بہو ابھی مری ہے۔ ان کا بڑھاپا ہے۔ کوئی لڑکی لڑکا نہیں۔ لاکھوں روپیہ ہے۔ سیکڑوں زیور ہیں۔ میری بات مان تو تیری لڑکی رانی بن جاوے گی!! — اس کی ماں سوچ رہی تھی اور سُن رہی تھی!

"ارے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ روزانہ ایسے لڑکے ہاتھ تھوڑے ہی آتے ہیں۔ اور لڑکوں کی تم خوشامد کرو گی۔ وہ تم سے روپیہ مانگے گے، مگر ان کو روپیہ کا ذرا بھی لالچ نہیں۔ بلکہ یہ تو ایسے امیر ہیں جو غریبوں پر دَیا کرتے ہیں! ان کو بہو چاہئے اور کچھ نہیں!!

چمپا کی ماں کے دماغ میں سب کچھ آگیا! وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کہا دروازہ پر آئے ہوئے دیوتا کو واپس نہ کرنا چاہئے۔ میری لڑکی کی ایسی قیمت کہاں تھی کہ وہ اتنے امیر گھر بیاہی جاتی! اس کو تو اب ایک نئی دنیا مل جائے گی۔ اس دلدر سے اس کو چھٹکارا مل جائے گا۔

چمپا نے بھی سنا اور حیران رہ گئی، وہ اپنی آیندہ زندگی کی تصویر کھینچنے لگی!! — دولت اس کی باندی ہو گی! — وہ نئی ساریاں پہنے ہر وقت پھرا کرے گی — اس کی نگاہ اپنی میلی دھوتی پر پڑی تو اس کے دل میں آیا کہ اس دھوتی کو ایسی جگہ چھپا دے جہاں اس کو کبھی نظر نہ پڑے!

بہت بڑا مکان ہے۔ مٹی کے فرش کے بجائے یہاں سنگ مرمر کے فرش ہیں جس پر پاؤں پڑتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے! چھوٹے چھوٹے کمروں کی بجائے یہاں بڑے بڑے کمرے ہیں جن کو وہ تعجب سے دیکھتی! اس کی ساس اس کے پاس آئی اور پوچھا ۔ "یہاں طبیعت لگ گئی" مگر چمپا نے اپنا منہ چھپا لیا۔ ایودھیا رانی نے خود ہی جواب دیدیا "یہاں طبیعت کیوں نہ لگے گی۔ شاید اب تم اپنے گھر جانے کا نام بھی نہ لوگی!! وہاں کچے مکان ہیں۔ تنگ گلی ہیں! چھوٹے چھوٹے اندھے کمروں میں جا کر اب کیا کرو گی!" ۔ اس کے پتی نے پوچھا "یہاں تمہاری طبیعت لگ گئی!" ۔ "جی" اس نے جواب دیدیا ۔ "اوہ' میں یہی چاہتا تھا! جب میری پہلی استری مری تو سارے بنگلہ میں مردنی چھا گئی تھی در و دیوار کھانے کو دوڑتے تھے۔ مگر اب وہی در و دیوار ہنس رہے ہیں! یہ تمہاری وجہ ہی سے ہے۔ تم جانتی ہو!! ۔ تم مجھ سے کبھی خفا نہ ہونا" چمپا کے دل میں خوشی کی گدگدی سی دوڑ گئی!!

چمپا کو پڑوس کی عورتیں دیکھنے آئیں! وہ شرما رہی تھی کیونکہ اس نے نئے نئے کپڑے۔ بہت قیمتی ساریاں اور زیور پہنے تھے۔

"گھر سے کیا آیا!"۔ کسی نے ایودھیا رانی سے پوچھا۔

"ارے یہ امید کر کے تھوڑے ہی شادی کی تھی۔ غریب گھر کی لڑکی ہے"

"تم نے بھی اچھا کیا۔ کہ غریب گھر کی بہو لی"

یہ کہنا چمپا کو کچھ اچھا نہ لگا۔ اس کو نئی نئی ساریاں مل گئیں، اس کی قسمت واقعی جاگ گئی ۔ مگر یہ گھر کی فضا کیسی!

بنگلہ میں ہمیشہ خاموشی رہتی۔ جو زور سے بولتا وہ بدتمیزوں میں گنا جاتا تھا ۔ ہر ایک ناپ تول کر بات کہتا!! ۔ کھانے کا کمرہ الگ بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کو اسی کمرہ میں کھانا پڑتا تھا ۔ ہر ایک ناک چڑھا کر بولتا تھا۔ ان لوگوں کی کچھ عادت سی معلوم ہوتی تھی۔ خاص طور پر عورتوں کی!! ۔ نوکر بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتے تھے اگر کوئی باہر کا آدمی ان سے کام کرنے کو کہتا تو ایک دو دفعہ تو ٹال دیتے جیسے کہ وہ کام کرنے کے لئے نہ ہوں اور یا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اتنے مصروف ہیں کہ ان کو سننے کی بھی فرصت نہیں!! ۔ ایسی فضا میں چمپا کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کو ہر ایک دفعہ سوچنا پڑتا تھا کہ کہیں ایسا کام نہ ہو جائے جو ان لوگوں کے رواج کے خلاف ہو۔ اس کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے گھر آئی ہے!! ۔ وہ ایسی فضا میں گھٹی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اس فضا میں آزادی بالکل نہیں تھی!!

اس کے پتی کی بہن جو نئی بہو کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہو رہی تھی، اس کے کان میں کہہ رہی تھی "تم ماتا جی کی بہت خدمت کرنا۔ وہ تم سے ہمدردی کرتی ہیں۔ اگر ان کو تم سے ہمدردی نہ ہوتی تو تم ہی سوچو کہ غریب گھر کی لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ماتا جی ہی کی وجہ سے ہوا" چمپا کو بھی ماننا پڑا کہ ایودھیا رانی ہی کے گن گانے چاہئیں ۔ اس روز سے اس نے ایودھیا رانی کی خدمت اس طرح کرنی شروع کی کہ کوئی لونڈی بھی نہ کرے گی ۔ وہ خیال کر لیتی "اگر میں خدمت نہ کروں گی تو دنیا میرے جنم میں تھوکے گی۔ سارے محلے میں۔ سارے شہر میں ہر ایک آدمی کو یہ معلوم ہے کہ ایودھیا رانی نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ ایودھیا رانی بھی اپنا کام کرانے میں نہ چوکتی تھی دن بھر اس کے سارے حکموں کی تعمیل کرتی اور رات کو ایودھیا رانی کے پاؤں دابتی اور جب تک وہ سو نہ جاتی دابتی رہتی!! ۔ اس کی انگلیاں اکڑ جاتیں! بانہیں درد کرنے لگتیں!! مگر ایودھیا رانی کو اس کی پروا نہ ہوتی۔

انسان تعریف کا بھوکا ہے۔ مگر چمپا تعریف کا ایک لفظ بھی نہ سنتی! وہ روزانہ خیال کرتی کہ آج شاید ایودھیا رانی کہے کہ تو نے بہت کام کیا ہے مگر ان لفظوں کو وہ کبھی نہ سنتی! پھر وہ خیال کرتی "اسے تعریف نہیں چاہئے! یہ تو اس کا فرض ہے، فرض ادا کرنے کی کیا تعریف؟"

ایک روز صبح وہ جلدی نہ اٹھ سکی۔ اس کی کمر اکڑی ہوئی تھی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ ہاتھ گرم ہو رہا تھا مگر ایودھیا رانی کو کیا معلوم!! اس نے دو تین مرتبہ دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا دی!

پتی نے کہدیا ۔ "اس کو بخار آگیا ہے!"

ایودھیا رانی نے کہا: "بخار ۔ اونہہ یوں ہی حرارت سی آگئی ہوگی۔ کیا ایسے میں کھاٹ پکڑ کر پڑ رہتے ہیں!! ۔ ایسا کچھ کام بھی تو گھر کا نہیں کرتی جو بخار آجاوے!!"

چمپا نے سنا ۔ "ایسا کچھ گھر کا کام بھی تو نہیں کرتی ہے!" اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل پر کسی نے گھونسا مارا ہو۔ چمپا نے خیال کیا کہ کیا اسی دن کے لئے وہ ان کی خدمت کر رہی تھی۔ مانتی ہوں میرے اوپر ان کا بہت بھاری احسان ہے مگر میں بھی تو ان کے احسان کا بدلہ چکا رہی ہوں۔

چمپا کا پتی اندر داخل ہوا۔ چمپا کا منہ اور لال ہو گیا تھا۔ "کیا اور تیز بخار آگیا ہے!!"

"میں گھر کا کچھ کام نہیں کرتی ہوں تو مجھے مرجانے دو!!"

"اوہ"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:۔ "تم ناراض ہو!!۔ ماں، ان کو مناؤ۔ یہ ناراض ہیں ان سے کہدو کہ یہ بہت کام کرتی ہیں" اور وہ ہنس دیا مگر ایودھیا رانی کو ہنسی نہ آئی۔ وہ بات سمجھ گئی۔

ایودھیا نے کہدیا۔ "میں کیا مناؤں۔ اگر ناراض ہیں تو ہوجانے دو! بڑی ناک والی ہیں نا؟

"تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قدر کچھ بھی نہیں! اگر وہ غریب گھر کی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ نیچ ہے، ماں کی خدمت بھی کرے اور ذلت بھی جھیلے!"

تمام دن یہی خیالات سر میں چکر لگاتے رہے۔ اور جیسے کسی بچّہ کو پالنے کے جھونکے سلاتے اور جگاتے رہتے ہیں اسی طرح سے یہ خیالات اس کو جگاتے اور سلاتے رہے!! اس نے اپنی بابت بہت کچھ سوچا۔ مگر وہ اپنے پتی اور ایودھیا رانی اور قسمت کے خلاف کچھ نہ سوچ سکی!! اپنے پتی کے خلاف کیا سوچے! وہ دیوتا تھا جس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ خوش ہوجایا کرتی تھی اور ایودھیا رانی کے خلاف کیا کہے! اگر ایودھیا رانی کے خلاف کچھ سوچے تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی قسمت کی بُرائی کر رہی ہے۔

چمپا نے دن بھر کچھ نہ کھایا۔

"کیوں ری آج سارے دن تو بھوکی پڑی رہی۔ تجھے ہمارا کچھ بھی خیال نہیں!!— تو کسی کا احسان نہیں مانتی!! تو جب اپنے باپ کے گھر تھی جب کی حالت کو سوچ اور اب کی حالت کو سوچ۔ یہ گدّے تکیے کیا وہاں نصیب آسکتے تھے۔" اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان گدّے تکیوں میں سے آگ نکلنے لگی ہو۔

آج سارا بھید اس پر کھُل گیا جس کو سچائی جان کر وہ کانپ جاتی تھی اور جس کا خیال وہ دل میں لاتے ہوئے بھی گھبراتی تھی۔ آج اس کے سامنے تھا۔ کیا یہ سب زیور کی وجہ سے ہے۔ کیا ان زیوروں نے میری عزت کھودی۔ اگر مجھے زیور نہ ملے ہوتے تو چاہے ماتھے پر بہت بڑا غریبی کا ٹیکہ لگا ہوتا مگر پھر بھی میری عزت ہوتی! مجھے سب بہو کی نظر سے دیکھتے۔ اس نظر سے کوئی نہ دیکھتا کہ میرے اوپر احسان کیا گیا ہے۔

وہ بستر سے اُٹھی۔ اس نے گدّے تکیے الگ رکھدئے۔ اس نے اپنی ساری اُتار ڈالی۔ اور اپنی پُرانی سفید دھوتی پہن لی۔ اس نے سونے کے زیوروں کا ڈبہ نکالا اور اس میں ایک ایک زیور اُتار کر رکھدیا۔ اس کو اب ایسا معلوم ہوا جیسے دل کا بوجھ کم ہوگیا۔

"ہائیں، یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے؟" اس کے پتی نے کہا۔ "تمھارے زیور تمھاری ساری کہاں ہے"

"اُتار دئے!—"

اس نے زیوروں کا بکس نکالا اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک زیور پہنانے لگا۔ "دُنیا کو بکنے دو۔ زیور تو میں نے دئے ہیں۔ میں تم کو زیور ہر وقت پہنے دیکھنا چاہتا ہوں"

اس کے چند دن بعد پتی کے بہن کی شادی ہوئی اور اس نے اپنے سارے گہنے بہن کو دیدئے!!

"تم نے پھر یہ کیا کیا؟؟ آج زیور پہننے کا دن ہے کہ ان کو اُتار کر بیٹھ جانے کا۔ بکس نکالو۔"

بکس نکلا مگر اس میں ایک بھی زیور نہ تھا۔

"ہائیں زیور کہاں گئے!!"

"مجھے تمھاری بہن کی شادی کی بہت خوشی تھی۔ میں نے سب گہنے اسے دیدئے ہیں۔"

اس کا پتی سناٹے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ سے زیوروں کا ڈبہ چھوٹ گیا۔

"میرا خیال غلط تھا کہ میں زیوروں سے خوش ہوسکوں گی! وہ تو بچپن کا خیال تھا۔ اب زیوروں کو اُتار کر ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو میں آج سے زیادہ کبھی خوش نہ تھی ..... تم کو مجھے خوش دیکھ کر خوش ہونا چاہئے!!"

پتی، چمپا کے بالوں میں اُنگلی ڈال کر سوچنے لگا۔

شنکر سروپ بھٹناگر

بازگشت خیال

مئے گلرنگ سے لبریز ہے مینائے خیال، میری ہر سانس ہے اک جرعۂ صہبائے خیال
تیرا آئینہ بنا جلوۂ زیبائے خیال، ہے ترے شوق میں آراستہ لیلائے خیال
دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

خواب دیکھے ہیں بہت عالم بیداری میں بیخودی میں، کبھی مستی، کبھی ہشیاری میں
عشرتیں لوٹی ہیں تخئیل کی گلکاری میں نظم و ترتیب میں، تزئین میں، طیاری میں،
دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شمع فانوس نے یہ حسن نہ پایا ہرگز اس طرح ٹوٹ کے پروانہ نہ آیا ہرگز
میرے مانند جلا دل نہ جلایا ہرگز جان بیتاب کو شعلہ نہ بنایا ہرگز
دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شوق جب دل کو ہوا انجمن آرائی کا آگیا سامنے جلوہ تری رعنائی کا
فکر نے کام دیا چشم تماشائی کا دور پر دور چلا ساغر مینائی کا،
دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

زخمہ زن ہوتی ہے اس طرح تری شوخ نظر دیتی ہے بے خبری عالم بالا کی خبر
چونک پڑتی ہے مری روح بھر یری لے کر شعر بن جاتا ہے اک نغمۂ لبریز اثر
دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

جاگ اُٹھیں وہ تمنائیں جو تھیں سوئی ہوئی
راہ پر آئیں وہ امیدیں جو تھیں کھوئی ہوئی
آرزوئیں ہوئیں شاداب جو تھیں روئی ہوئی
لہلہاتی ہے ہر اک کشت مری بوئی ہوئی

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

تجھ سے کاشانۂ ہستی مرا آباد ہوا
جس قدر رنج سہے اور بھی دل شاد ہوا
للہ الحمد کہ ہر قید سے آزاد ہوا
ایک گلزار طرب عالم ایجاد ہوا

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حُسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

مرزا جعفر علی خاں اثر
(خان بہادر)

آئرس[1]

چوم کر منہ گلِ آئرس سے یہ میں نے پوچھا
اس مہک پر تجھے دیوانہ ہوا کیوں مرغوب؟
مسکرا کر یہ کہا، شاعروارستہ مزاج
راہ چلتے ہوئی مجھ پر بھی عنایت، کیا خوب!
خیر منظور ہے مجھ کو تری خاطر، سُن لے
آبتاؤں تجھے، صحرا سے ہوا کیوں منسوب،
تیری ہی طرح مجھے فطرت آزاد ملی
تیری ہی طرح نمایش کو بھی سمجھا معیوب
ملتفت مجھ سے نہیں ہوتے جو ظاہر بیں ہیں
حُسن میرا ہے فقط اہلِ نظر کو محبوب

وہ گلستاں ہی سہی قید ہے پھر قید اثر
ذوق پرواز کو ہے وسعتِ "لاشے" مطلوب

مرزا جعفر علی خاں اثر
(خان بہادر)

---

[1] آئرس، کشمیر کا ایک سپید خودرو پھول۔

زار سے اسٹالین تک

اس وقت ساری دُنیا کی آنکھیں اسٹالین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اسٹالین کے معنے "فولادی انسان" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کا مقابلہ کرنے میں اس نے اپنے آہنی عزم و ارادہ کا پورا ثبوت دیدیا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اسٹالین کی یہ کامیابیاں ممکن ہیں عارضی ہوں اور روسی آبادی زیادہ عرصہ تک اس کشاکش کو برداشت نہ کرسکے، لیکن اگر انقلاب روس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سوویٹ حکومت کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں اور دُنیا کی کوئی قوت اسے غلام بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

دنیا میں اس وقت تک بہت سے انقلابات ہوئے ہیں جن میں انقلاب فرانس کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس کا انقلاب اس سے کہیں زیادہ اہم تھا، کیونکہ فرانس کا انقلاب دُنیا میں کوئی ایسی حکومت قایم نہ کرسکا جو جماعتی تفریق کو یکسر مٹادے۔ لیکن انقلاب روس کے بعد سارا ملک ایک ایسے نظریۂ حکومت پر متفق و متحد ہوگیا ہے جس کے بدلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

انقلاب فرانس نے اس میں شک نہیں کہ سارے یورپ کو ہلا کر رکھدیا، لیکن روس اس سے بالکل متاثر نہیں ہوا، بلکہ زار کا اقتدار اور بڑھ گیا اور زاریت اہل روس کے لئے بے پناہ عذاب بنکر رہ گئی۔

صدیاں گزر چکی تھیں کہ روس کا زراعتی طبقہ غلامی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اور زار کے ظالمانہ اقتدار کو دور کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن جب جنگ کریمیا میں روس کو شکست ہوئی تو روسی آبادی کی آنکھیں کھلیں اور اس کے بعد جب ۱۹۰۵ء میں جاپان نے زار کی فوجوں کو شکست دی، تو انقلاب کی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی اور ہڑتالوں کا بازار گرم ہوگیا۔ اسی دوران میں زار کا چچا (گرانڈ ڈیوک Sergei) قتل کیا گیا اور ملک میں عام بے چینی پیدا ہوچلی۔

ہر چند زار نے لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن حالات بہت کچھ بدل گئے تھے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ الگزنڈر دوم کے قتل کے بعد لینن کے بھائی نے زار کے خلاف سنٹ پیٹرسبرگ میں زبردست سازش شروع کی، لیکن حملہ کا جو دن مقرر کیا گیا تھا اسی دن وہ گرفتار کرکے قتل کردیا گیا — اسوقت لینن کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور یونیورسٹی میں تعلیم پارہا تھا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ ذہنی انقلاب تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے، اس لئے زاریت کے خلاف پروپاگنڈا شروع کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں سوشلسٹ جماعت برسر اقتدار تھی اور وہاں سب سے پہلی "لیبر یونین" (مجلس اتحاد عمال) قایم ہوچکی تھی۔ اسکو دیکھکر لینن کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے بھی اپنے چند احباب کی مدد سے روس میں ایسی ہی یونین قایم کرنا چاہی۔ چنانچہ سارے ملک نے ایک زبردست ہڑتال کے ذریعہ سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، لیکن زار نے اس تحریک کو بڑھنے نہ دیا اور لینن کو جلاوطن کرکے سائبیریا بھیجدیا۔

اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی، تو انقلاب پسندوں کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا اور ۱۹۱۷ء کے آغاز میں پیٹروگراڈ میں بغاوت شروع ہوگئی زار نے باغیوں پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن فوج نے انکار کردیا اور زار نے موقع کی نزاکت کا احساس کرکے ۱۵ مارچ کو تخت سے دستبرداری کا اعلان کردیا۔

اس کے بعد نئی حکومت قایم ہوئی جس کا وزیر اعظم "پرنس لووف" (Lvov) اور وزیر جنگ، کرنسکی منتخب کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد کرنسکی وزیر اعظم ہوگیا، لیکن یہ نئی حکومت ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی کہ ماڈریٹ اور انتہا پسند جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا۔ ماڈریٹ چاہتے تھے کہ لڑائی جاری رکھی جائے اور انتہا پسند انقلاب چاہتے تھے۔ چونکہ جرمنی اس وقت لڑائی سے تھک چکا تھا اور چاہتا تھا کہ روس میں انقلاب پسند جماعت کو کامیابی حاصل ہو، اس لئے اس نے بھی خفیہ طور پر انقلاب روس کی کامیابی کی کوشش کی اور لینن کو جو اسوقت جرمنی ہی میں تھا مسلح و مقفل ٹرین کے ذریعہ سے روس پہونچا دیا۔ جب لینن یہاں پہونچا، تو کرنسکی بھاگ گیا اور لینن نے پورا اقتدار حاصل کرکے سوویٹ (کونسل) قایم کردی اور ٹراٹسکی کو وزیر خارجہ بنادیا۔

انھوں نے اس کے بعد ہی روس کے تعلقات اتحادیوں سے قطع کر دئے اور جرمنی کے ساتھ علٰحدہ صلح کر لی۔ اس سے لینن کا مقصود صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح انقلاب کو کامیاب بنا سکے اور اپنے ملک کی اقتصادی حالت کو درست کر سکے۔ ہر چند صلح نامہ کی رو سے، پولینڈ، اوکرائن، فن لینڈ، علاقۂ بالٹک سب سے روس کو دست بردار ہونا پڑا، لیکن بعد کو تاریخ نے ثابت کر دیا کہ دراصل فتح لینن ہی کو حاصل ہوئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اب حکومت لینن ہی کے ہاتھ میں تھی، لیکن اس کے متبعین اب بھی اقلیت میں تھے اور جب جنوری ۱۸ء میں ملک کے تمام نمایندوں کا جلسہ ہوا تو بالشویک حکومت کے مخالفین زیادہ نظر آئے۔ لینن نے ہوا کا یہ رُخ دیکھ کر پھر لوگوں کے دلوں میں بالشیوک حکومت کے برکات ذہن نشین کرنا شروع کئے اور پایۂ تخت پٹروگراڈ سے ماسکو منتقل کر دیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۸ء میں زار کے خاندان کا قتل عمل میں آیا اور کلیسا ؤں کی جایداد ضبط کر لی گئی۔

اسوقت تک لینن نے جو کچھ کیا اس سے جنگ کا مسئلہ تو بیشک طے ہو گیا، لیکن اقتصادی اُلجھن بدستور باقی رہی، آخر کار ۲۱ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ مزارعین اپنی پیداوار کے مالک ہیں اور وہ اسے اپنے طور پر بازار میں فروخت کر سکتے ہیں۔ لینن سمجھتا تھا کہ اگر اس وقت اس نے اپنی نئی پالیسی کو رائج کرنا چاہا تو انقلاب میں کامیابی نہ ہوگی۔ الغرض لینن نے نہایت ہوشیاری اور ترکیب سے کامل تین سال کی کوشش کے بعد رفتہ رفتہ سوویٹ حکومت کی بنیاد مضبوط کر لی، لیکن بدقسمتی سے ایک دن کسی عورت نے جو اس کی پالیسی کی مخالف تھی اسے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ ایک سال تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

لینن کا جانشین قدرتاً ٹراٹسکی کو ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ ٹراٹسکی بین الاقوامی انقلاب کا حامی تھا اور لینن کی اقتصادی پالیسی کا بھی مخالف تھا، اس لئے لینن کی پارٹی اس کی مخالف ہو گئی اور تھوڑے سے خلفشار کے بعد اسٹالین برسرِ اقتدار ہو گیا۔ اسٹالین، لینن کا بڑا معتقد تھا اور وہ انقلاب کو روس کے اندر ہی محدود رکھ کر پہلے اپنے ملک کو مضبوط بنانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اقتصادی و عسکری، صنعتی و زرعی ترقی کی طرف توجہ کی اور ۲۸ء میں اپنی پہلی پنج سالہ اسکیم پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ اس اسکیم میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ۳۳ء میں دوسری پنج سالہ اسکیم کا آغاز ہوا جو پہلے سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

اسٹالین کا مقصود اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ صلح و آشتی رکھ کر ترقی کرنا تھا، یہاں تک کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ۳۹ء میں جرمنی سے بھی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا، لیکن چونکہ اسٹالین جانتا تھا کہ ہٹلر کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے وہ فوجی طیاریاں بھی کرتا جاتا تھا اور آخر کار اسٹالین کا اندیشہ پورا ہو کر رہا اور نازیوں نے روس پر حملہ کر ہی دیا۔

روس کا موجودہ عسکری نظام

اس میں شک نہیں کہ اول اول جرمنی کو روس کے مقابلہ میں بہت کامیابی ہوئی، لیکن اب صورت بہت کچھ بدل چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موسم سرما نے بھی جرمن افواج کے اقدام کو روکنے میں بڑی مدد دی ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پچھلے گیارہ ماہ کے اندر روسی افواج کے نظام میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے اور مارشل ٹموشنکو نے وہاں کی فوجوں کی حالت بہت کچھ بدل دی ہے۔

اس سے قبل سُرخ افواج کا نظام یہ تھا کہ افسر اور معمولی سپاہی میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا، یہاں تک کہ سپاہی اگر راستہ میں اپنے افسر سے ملتا تو سلام کرنے پر بھی مجبور نہ تھا، اس میں شک نہیں کہ یہ جذبۂ مساوات بڑی عمدہ چیز ہے اور بہ حالت امن فوج کے لئے بھی بُرا نہیں، لیکن بہ حالت جنگ اس کا تجربہ اچھا ثابت نہ ہوا چنانچہ مارشل ٹموشنکو نے فوج کی تنظیم بالکل بدل دی۔

نازی طریق جنگ کو دیکھ کر ٹموشنکو نے محسوس کیا کہ فوج کے لئے لازم ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر جلد سے جلد قدم اُٹھائے اور اس کے تمام دستوں میں اتحادِ عمل پایا جائے چنانچہ اس نے سب سے پہلے روس کی تمام افواج کو صرف ایک مرکز سے وابستہ کیا اور اسی کے ساتھ جو غلط قسم کی جمہوریت و مساوات ان میں پائی جاتی تھی اسے دور کیا تاکہ افسر کی طرف سے جب کوئی حکم دیا جائے تو یہ بحث نہ شروع ہو کہ یہ حکم مناسب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ سپاہیوں کی از سرِ نو تنظیم کر کے ان کو احکام کی پابندی، جفاکشی اور صبر و استقلال کی تعلیم دی گئی، چنانچہ گیارہ ماہ کے اندر روسی فوج کی حالت بالکل بدل گئی۔

اب سُرخ افواج کی تنظیم کلب کی تنظیم نہیں ہے، جہاں صرف گپ لڑائی جاتی ہے اور افسر و سپاہی کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ شہری آبادی میں بھی (جو اسپرٹ پیدا کی جا رہی ہے اور مدارس میں پانچویں درجہ سے فوجی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ الغرض اب سُرخ افواج کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے اور اسی تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ روس نے دفاع کے ساتھ جارحانہ اقدام بھی شروع کر دیا ہے۔

روس کے ذرایع دفاع

لڑائی میں کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے، ایک عسکری تنظیم، دوسرے، اقتصادی اطمینان اور صنعت حربی کا استحکام۔ روس کی فوجی تنظیم کا مختصر حال ابھی آپ سُن چکے، اب دوسری بات کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ روس اس باب میں بہت مضبوط ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اوکرائن، سفید روس اور کریمیا، روس کے بڑے اہم زرخیز علاقے ہیں جہاں زراعت و صنعت کے مرکز بکثرت پائے جاتے ہیں، لیکن غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ روس کے اصلی صنعتی مرکز میدان جنگ سے ۸۰۰ میل دور کوہستان یورال میں واقع ہیں اور اب کہ مغربی روس میں دشمن کے حملہ کی وجہ سے یہاں کے تمام صنعتی مرکز درہم برہم ہو رہے ہیں، ہر قسم کی کمک یورال ہی کی طرف سے پہونچ رہی ہے۔

مسٹر جان اسکاٹ جس نے خود اس حصۂ ملک کی سیاحت کی ہے، لکھتے ہیں کہ ۲۰۰ سے زیادہ صنعتی کارخانے سنہ ۳۰ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان یہاں قایم ہو چکے ہیں جو کوہستان کے اندر نہایت مخفی طریقہ سے رات دن کام کر رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کام کرنے والے سب کے سب روسی ہیں اور حکومت نے ان کے چلانے کے لئے کسی سے قرض نہیں لیا۔

ایک مقام ہے مگنی ٹوگورسک جو سنہ ۲۹ء میں ایک معمولی کوہستانی گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اب وہ دُنیا کی سب سے بڑی معدن کویلے اور لوہے کی ہے۔ حکومت نے دو ارب روبل کے صرف سے یہاں لوہا اور کویلہ نکالنے کے کارخانے قایم کئے ہیں جو شب و روز کام کر رہے ہیں اور روس کو بڑی حد تک ان دونوں چیزوں کی طرف سے بے نیاز بنائے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک معدن پٹرول کی بھی ہے جو دُنیا کی سب سے بڑی معدن خیال کی جاتی ہے۔ یہاں سے کم از کم ۵ لاکھ ٹن صاف شدہ پٹرول ہوائی جہازوں کے لئے سالانہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس علاقہ میں بیس ہوائی جہاز بنانے والے کارخانے بھی ہیں جو دشمن کی زد سے محفوظ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی حال یہاں کے ذخایر غلّہ کا ہے جو سیکڑوں میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے کسی ملک کو تیل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی روس کو ہے، کیونکہ یہاں کی تمام صنعت اور ساری زراعت بالکل میکانکی صورت اختیار کر چکی ہے اور زندگی کا ہر شعبہ مشین پر قایم ہے، لیکن اگر اوکرائن اور کریمیا کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو بھی اس کی پٹرولی پیداوار جو کوہستان یورال میں پائی جاتی ہے، اسے سالہا سال تک جرمنی کے مقابلہ پر آمادہ رکھ سکتی ہے۔

نگار کے مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا: - اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد: - شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے قیمت ۸

اقبال کی شاعری: - یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ۔

مقام محمود: - مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت پانچ روپیہ۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار کے بعض خاص نمبروں کے متعلق ضروری اعلان

نگار جنوری سنہ ۳۲ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا۔ اور نگار جنوری سنہ ۳۵ء (اُردو شاعری نمبر) اور نگار جنوری سنہ ۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) بالکل ختم ہو گئے ہیں، جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی اُن کے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کر سکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

نگار جنوری سنہ ۳۸ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب تین روپیہ فی کاپی اور نگار جنوری سنہ ۳۷ء (اصحاب کہف ڈرامہ) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی لی جائے گی۔

جن حضرات کے پاس سنہ ۳۶ء سے سنہ ۴۲ء تک کے نمبر نہیں ہیں وہ ابھی طلب فرمالیں ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گی۔

منیجر نگار

زندگی

فسردگی سے میں کرتا ہوں تازگی پیدا
مرے شباب سے دنیا ہے خُلد کی پیدا

گھٹا سے ہے مجھے تخلیق برق کا ارماں
اندھیریوں سے میں کرتا ہوں روشنی پیدا

تصوّرات کے بل پر مرے شبستاں میں
شبِ مہیب سے ہوتی ہے چاندنی پیدا

بہار ہو کہ نہ ہو، میرا ذوق کرتا ہے
خزاں کے روپ میں اندازِ دلکشی پیدا

نشاط اور مسرّت میں مست رہتا ہوں
مذاقِ غم سے ہے یک گونہ سرخوشی پیدا

روش روش پہ بچھاتا ہوں رات کو تارے
سرشکِ غم سے ہے اک نوع کی ہنسی پیدا

مجھے یبوست زہد و ورع نہیں منظور
گُنہ سے کرتا ہوں احساسِ زندگی پیدا

میں چاہتا ہوں کہ ہنگامہ زار ہو دُنیا
خموشیوں سے ہو اک شور دائمی پیدا

میں چاہتا ہوں رواں و دواں رہے عالم
کہ ہو جمودِ دو عالم میں برہمی پیدا

نگار خانۂ ہستی مرا تبسّم ہے
گرفتگی سے مرے دل کی ہے کلی پیدا

حیاتِ نو کا پیامِ شگفتہ لایا ہوں
کروں گا بزم میں اک زندگی نئی پیدا

وہ زندگی کہ جو ہنگامہ در کنار رہے
وہ زندگی نہیں جو سرد و ناگوار رہے

نبی احمد بریلوی

مکتوبات نیاز

مکرمی - گرامی نامہ ملا - ہاں، میں اس کو خوب جانتا ہوں

نامرادانہ زیست کرتا تھا

لیکن شاید اس قدر عتاب و سرزنش کا سزاوار نہ تھا

یہ درست ہے کہ مصائب کا زیادہ حصہ خود انسان ہی کی غلطی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، لیکن انسان اسقدر احمق کیوں ہے ؟ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے

اگر ہماری سوسائٹی قدرت کی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کرسکتی تو قدرت کے بگاڑوں کو برا بھلا کہنے کا حق بھی اسے حاصل نہیں - سب سے آخری مرتبہ اب سے دو سال پہلے یہیں لکھنؤ کی گلیوں میں آپ خاک بسر، گریباں چاک دیکھا تھا، پھر تلاش کے باوجود پتہ نہ چلا - اب آپ سے معلوم ہوا کہ وہ امڑ رہے ہیں اور اس حال میں کہ بجائے رحم کے آپ کو غصہ آرہا ہے

اگر زحمت نہ ہو تو ٹکٹ لیکر اسے ریل پر سوار کرا کے تار دیجئے - مجھے اس سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اور اب تو آپ کے عتاب سے اور زیادہ ہوگئی ہے ؟

حضرت، خط ملا، آپ کی خفگی کا جواب صرف یہ تھا کہ وہیں آپ کے سامنے پہونچکر خودکشی کرتا، لیکن اسوقت تک آپ کی اور تمام نامعقول باتوں کا معقول جواب کب دے سکا ہوں کہ اب کامیاب ہوتا -

آپ جانتے ہیں مجھے وہاں جانے کے خیال سے روحی تکلیف ہوتی ہے اور آپ کے نزدیک بار بار اصرار کرنا مجاہدہ ہے، دینی فرض ہے، جس کے پورا کرنے پر آپ خدا و رسول کی طرف سے مجبور ہیں

اگر یہ صرف چھیڑ ہے تو مرے لئے خطرہ سے خالی نہیں اور اگر سنجیدگی ہے تو آپ کو بھی اپنے انجام سے ڈرنا چاہئے مانا کہ میرا مطالعہ ناقص ہے، لیکن معاف فرمایئے میں اس کی تکمیل کا آرزومند نہیں - آپ اگر خنوتیاں رازمیں سے ہیں تو آپ کو یہ "قاب قوسین" مبارک ! آپ کیوں اپنی فردوس کو میرے جہنم کے خیال سے بے لطف بناتے ہیں !

مجھے اس زندگی سے آگے جینا نہیں اور اس کے ختم ہونے میں اب صرف چند سال باقی ہیں۔ اگر کوشش کروں تو بھی دل کی سیاہی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی، مجھ سے خدا کی پرستش تو ہوتی نہیں، بندۂ خدا کی کیا ہوگی! آپ شوق سے تشریف لائیے، غریب خانہ حاضر ہے، لیکن اس غریب کو غیر حاضر ہی سمجھئے گا

جی ہاں، کل ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ کیا کہنا ہے

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

لیکن سچ پوچھئے تو مجھے افسوس ہوا۔ ہر چند جوانی کی باتوں کو جوانی کی نگاہ سے دیکھنے کا زمانہ نہیں، تاہم یہ فصلِ بہار کبھی مجھ پر بھی گزر چکی ہے اور عالم شیب میں قوت تصور تو خیر بڑھ ہی جاتی ہے، اس لئے سمجھتا ہوں کہ یہ "انہونی" بات بھی کچھ موقع سے نہیں ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہو بھی کیا سکتا ہے؟

بہر حال اس وقت وہ نشہ میں چور ہیں۔ نہ لغزش کا خوف، نہ گرنے کا خیال، نہ ملامت کی فکر نہ اندیشۂ مآل ——— کچھ دن گزر جانے دیجئے، شاید ہوش آجائے! میں نے آپ سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ خود بیں انسان بہت جلد ٹھوکر کھاتا ہے اور وہی ہوا۔ آپ کو اُن کے حُسن ذوق اور بلندی فطرت پر اعتماد تھا اور مجھے انھیں باتوں سے اندیشہ! خیر، وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی ماحول کو گوارا بنایا جائے اور یہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ آئیے یا کسی ایسے شخص کو بھیجئے جو اِن پر نہیں، اُن پر زیادہ اثر رکھتا ہو!

دیکھئے آپ پھر مہینوں سے چُپ ہیں اور جب یہ خاموشی دور ہوگی تو حسب معمول اُلٹا الزام مجھی پر رکھیں گی!

میں جانتا ہوں کہ عورت کو شکایت میں زیادہ لطف آتا ہے اور جب کسی کی طرف سے کوئی بات شکایت کی پیدا نہ ہو، تو اسے غصہ آجاتا ہے! لیکن اگر یہ صرف چھیڑ چھاڑ یا گرمی محبت قایم رکھنے کے لئے ہو تو خیر کوئی حرج نہیں، لیکن جب یہ بات نہ ہو، تو پھر؟

میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ نئے تعلق سے آپ خوش ہیں یا نہیں، آپ نے اس کا جواب بہت مبہم دیا لیکن اندازِ تحریر میں ایک چھپی ہوئی آہ محسوس کرکے، میں نے عرض کیا کہ ذرا صاف صاف لکھئے، اور اس کے جواب میں آپنے خاموشی اختیار کرلی ——— ڈر رہا ہوں کہیں یہ وہ وقفہ نہ ہو جو بات کرنے سے پہلے رونے کے لئے درکار ہوتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے صرف اس لئے ہمدردی ہے کہ آپ میری جنس کی ستائی ہوئی ہیں، اور میں بطور فرض کفایہ سب کی طرف سے اس کی تلافی تو خیر کیا کر سکتا ہوں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اب دوبارہ یہ تلخ نوش آپ کو گوارا نہ کرنا پڑے اور اسی لئے آپ کے اس فیصلہ سے میں خوش ہوا تھا کہ آیندہ اپنی زندگی آپ مردوں کی طرح بسر کرینگی۔

اس کے بعد جب آپ نے اپنی لڑکی کو علیگڈھ تعلیم کے لئے بھیجدیا تو مجھے آپ کے اس عزم کا زیادہ یقین ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد دفعتاً آپ نے اپنے نکاح کی خبر سنائی۔ اول اول تو مجھے اس کے باور کرنے میں تامل ہوا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ عورت بہرحال عورت ہے اور وہ دوسروں کا سہارا لینے کے بعد ہی خوش رہ سکتی ہے، میں نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ سُنا اور بے اختیار جی چاہا کہ کچھ تفصیل معلوم کروں۔ مگر۔ آپ کی مبہم تحریر اور اس کے بعد آپ کے سکوت نے پھر اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا کر دئے

اگر آپ نے پھر وہی غلطی کی ہے جو پہلے کی تھی، تو بھی مجھ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر اس سکوت کا سبب فرطِ نشاط ہے تو بھی اطلاع دیجئے، یہ سُنکر مجھ سے زیادہ خوشی کسے ہو سکتی ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو بچّی کے متعلق بھی لکھئے کہ اب وہ کہاں ہے۔ اگر اب بھی علیگڈھ میں ہے تو میں دہلی آتے جاتے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں،

قبلۂ محترم!

یہ درست ہے کہ اس خار زار نے میرے پاؤں زخمی کر دئے ہیں، لیکن جب آپ ایسے ہمدردی کرنے والے موجود ہوں تو پھر ——— وانگہ کرا پروائے جاں کز پائے نشتر بر کند

زندگی کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر یہ شکایت کرنا کہ

کیوں ترا راہگزر یاد نہ آیا

شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ——— بالکل درست!

لیکن اس "یوں بھی" کے جمود و تعطل کو تو دیکھئے ——— یہ لنگر گرانجانی کم از کم میرے بس کی چیز تو ہے نہیں! اگر یہ واقعی کوئی مرض ہے تو بھی مداوا کی حد سے گزرا ہوا۔ اس لئے ضرورت ہمدردی کی ہے نہ کہ طعن و ملامت کی۔ شکر ہے کہ آپ اس رمز سے واقف ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ——— کہ ——— سعدی در تو حیران ست و مدہوش

حدیثِ حُسن خود از دیگراں پُرس!

میرے ساتھ تمہارا جو معاملہ ہے، وہ تو خیر ایسا ہے کہ مجھے تمہاری اچھی باتیں بھی بُری معلوم ہوتی ہیں، لیکن محلہ میں، شہر میں، ملک میں اور لوگ بھی موجود ہیں، اُن سے پوچھو کہ تم میں اچھائیاں کیا کیا ہیں ——— میں نے تم سے بارہا کہا کہ اگر تمہارے اخلاق کی تکمیل میں کسی بات کی کمی ہے تو صرف یہ کہ تم کسی کے مُرید نہیں ہو ——— اگر یہ کمی پوری ہو جائے

تو پھر تمہارا جواب نہیں، لیکن تم سنتے ہی نہیں، مذاق سمجھتے ہو۔

دیکھو بعض باتیں انسان میں وہبی طور پر بُری ہوتی ہیں، سو وہ تم میں موجود ہی ہیں، لیکن بعض بُرائیاں اکتسابی بھی ہوتی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ "دست بیع" ہو جانا ہے۔ اس کوچہ میں آؤ تو پتہ چلے کہ کیسے کیسے "رموز سیات" ابھی تک تمہارے لئے "ناکشودہ" پڑے ہوئے ہیں۔

سُنا ہے تمہارے بھائی صاحب نے تو ایک مزار نواڈا بنا لیا ہے اور وہاں "کشف حجاب" اکثر ہوتا رہتا ہے پھر تمہیں کیوں تامل ہے؟

جی ہاں، معاملہ کچھ سرد تو ہو گیا ہے لیکن

گیرد صبا خراج ز خاکسترم ہنوز

اب بھی "خانوادہائے علم و فضل" سے جو جھونکا ادھر آتا ہے وہ گرم ہی ہوتا ہے! خدا کے لئے آپ ہی ان کو سمجھائیے کہ خدا سے محبت کرنا یہ کب سکھائیں گے۔ صدیاں گزر گئیں کہ خدا کو انھوں نے ہیبت و جلال والا بادشاہ بنا کر پیش کیا۔ اب اسے عرش سے نیچے اُتار کر ذرا فرش پر بھی تو لائیں، خاک نشینوں کو بھی تو دیکھنے کا موقع دیں۔ آخر وہ وقت کب آئے گا جب خدا انسان سے گھُل ملکر اپنی جگہ ان کے دل میں پیدا کرے گا۔

خدا کے جس تصور نے اس وقت ساری دُنیا کو خاک و خون میں تڑپا رکھا ہے، کیا وہ اب بھی ختم نہ ہوگا، کیا عقلاء نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک انسانی آبادی ختم نہ ہو جائے گی وہ خُدا کو اس مصیبت زدہ کرۂ زمین پر آنے کی اجازت نہ دیں گے ـــ کیا خدا کی حکومت اب صرف درندوں اور عفریتوں پر ہوگی ـــ یہ آخر قصہ کیا ہے۔ سچ کہتا ہوں، بعض وقت ایسا محسوس کرتا ہوں کہ سینہ شق ہو جائے گا، لیکن کہوں کس سے، ان شقیوں سے! معاذاللہ!

"نگار"

جنوری فروری ۱۹۴۱ء اور جنوری فروری ۱۹۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرما لیجئے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگا لیجئے۔ ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اُردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔

منیجر نگار

آپ کیسے ہیں ؟

سنئے

دل میں غم آ! دبے یا شادمانی یہ نہ پوچھ
کس ڈگر پر چل رہی ہے زندگانی یہ نہ پوچھ

میرے دامن میں گل و نسترہیں اتنا دیکھ لے
میری آنکھوں میں شرارے ہیں کہ پانی یہ نہ پوچھ

دیکھتی ہے اب بھی یہ دُنیا مجھے ہنستا ہوا
اس ہنسی میں موت ہے یا زندگانی یہ نہ پوچھ

ایک جانب وقت کی قوت ہے اک جانب ہے دل
کون کس پر کر رہا ہے مہربانی یہ نہ پوچھ

فرصتیں میں نے اگر چاہا تو پھر بلجائیں گی،
گیت لیکن گا سکے گی پھر جوانی یہ نہ پوچھ

بس یونہی آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے کبھی
کوئی ہوتی بھی ہے وجہ شادمانی یہ نہ پوچھ

دیکھ یہ ہاتھوں کے چھالے، دیکھ چہرے کی خراش
پھر بھی کیوں ہیں ہونٹ صرف نغمہ خوانی یہ نہ پوچھ

زندگی یکسر تڑپ ہے زندگی یکسر گداز
ماورائے شوق باقی ہے کہ فانی یہ نہ پوچھ

میں کہاں پر ختم کر سکتا ہوں اپنی داستاں
میں کہاں سے کہہ سکوں گا اب کہانی یہ نہ پوچھ

فضل الدین اثر ایم۔ اے۔ بی ٹی

غزل

تری سعیٔ کرم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے
کہ اب کچھ تیز تر عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

وہ کھائے ہیں سرِ منزل فریبِ زندگی میں نے
کہ گردِ رہگزر بھی کارواں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ شوق ہی پروردگارِ حسنِ رنگیں ہے
یہی دریا، یہی موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

لرز جاتا تھا جس کو دیکھ کر اپنے نشیمن پر
وہی بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نظر پڑتی ہے جا کر جب آلِ حسنِ رنگیں پر
کلی کھلنے سے پہلے خونچکاں معلوم ہوتی ہے

مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

قیامت ہے تلاطم شور دریائے محبت کا
جو موج اُٹھتی ہے وہ ساحل نشاں معلوم ہوتی ہے

(پروفیسر) شور

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید علی سجاد مرزا - سہارن پور)

مارچ کے نگار میں شرح کلام مومن کا سلسلہ "غم کرتے ہیں" کی زمین تک پہونچا تھا۔ اب اسکے آگے کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں۔ ان پر بھی توجہ فرمایئے۔

۱- صورت دکھائے جو کبھی جا کے خواب میں — بیدید آنکھ کھول دے جھنجھلا کے خواب میں

کیا بیدید سے مراد یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے وہ جھنجھلا کے آنکھ کھول دیتا ہے۔

۲- شب وہ جو سو رہے مرے پاس آکے خواب میں، — جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

تمنا کے خواب میں کس کے بخت خفتہ جاگے ؟

۳- آنکھوں کو بند کرکے وہیں کھولدے گر آئے — یوسف کسی کے محو تماشہ کے خواب میں

کون آنکھ بند کرکے کھولدے اور کیوں ؟

۴- کا بوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے — کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے اور اس کا پورے شعر سے کیا تعلق ہے ؟

۵- سو رہتے پائے ناقہ زمان وداع گر — طالع نہ ہوتے قیس کے لیلیٰ کے خواب میں

دوسرا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے "لیلیٰ کے خواب میں قیس کے طالع نہ ہوتے"۔ یہ کیا بات ہوئی ؟

۶- نیرنگ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ — اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

پورے شعر کا مفہوم چاہتا ہوں۔

۷- رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں، — کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

پورے شعر کا مطلب بیان فرمایئے۔

۸- اُس کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر — یاں پاؤں جاگتے ہیں کوئی جا کے خواب میں

کیا مطلب ہے۔

۹- سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے — کہتا ہے سوتے ہو مرے بن آکے خواب میں

دوسرے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے۔

۱۰- سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈھوں جو مومن آب میں — ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

دوسرے مصرعہ کا کیا مفہوم ہے۔

۱۱- گر ہو وہ دست حنائی عکس افگن خواب میں — ہووے مرجاں جوں چنار آتش زن بن آب میں

دوسرے مصرعہ کا کیا مفہوم رکھتا ہے۔

۱۲- دی دل سوزاں کو تشبیہ سمندر میں نے اب — چھوڑ کر آتشکدہ ڈھونڈھے ہے مسکن آب میں

پورے شعر کا مفہوم درکار ہے۔

۱۳- یاد چشم یار میں دریا پہ رویا بن گئیں — مردم آبی کی پلکیں، شمع روشن آب میں

کیا مفہوم ہے۔

۱۴۔ دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

کیا مطلب ہے۔

(نگار) ۱۔ "بیدید" کے معنی بیمروت و سنگدل کے ہیں۔ اسی معنے میں "بیدیدہ" بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کبھی خواب میں بھی مجھے دیکھ لیتا تو وہ بیمروت فوراً جھنجھلا کے آنکھیں کھول دیتا ہے۔

۲۔ "تمنا کے خواب میں" نہ کہئے۔ دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہوگی "تمنا کے بخت خفتہ، خواب میں جاگے تھے"۔ اب مطلب صاف ہوگیا۔

۳۔ وہ شخص جو میرا محو تماشہ ہے وہ اگر یوسف بھی خواب میں نظر آئے تو فوراً آنکھیں کھولدے۔ مطلب یہ کہ جو تیرا تماشائی ہے وہ یوسف پر بھی نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

دوسرے مصرعہ میں کسی کے بعد کے بیکار معلوم ہوتا ہے "کسی محو تماشہ کے خواب میں" ہونا چاہئے، اس لئے مجھے اس مصرعہ کی صحت میں کلام ہے۔

۴۔ کابوس ایک بیماری ہے جس میں انسان سوتے سوتے چونک پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بار بار چونک پڑنے کو اطبا کابوس کا مرض بتاتے ہیں، حالانکہ اسکا سبب یہ ہے کہ میرا محبوب مجھے خواب میں نظر آتا ہے۔ اس لئے بربنائے رشک میں یہ تو گوارا نہیں کرسکتا کہ میرا محبوب ہی طبیبوں کو خواب میں نظر آئے لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی اور حسین انھیں اسی طرح نظر آئے اور وہ بھی میری طرح چونک چونک پڑیں۔ اور اس طرح انھیں حقیقت کا علم ہوسکے۔

۵۔ دوسرے مصرعہ میں "قیس کے" بعد اور محذوف ہے۔ یعنی اگر قیس کے اور لیلےٰ کے طائر خواب میں نہ ہوتے تو وداع کے وقت ناقۂ لیلیٰ کے پاؤں سو جاتے اور وہ روانہ نہ ہوسکتی۔

۶۔ مشہور ہے کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھنچکر زلیخا کے پاس پہونچ گئے۔ مومن کہتے ہیں کہ جو کشش زلیخا کے خواب میں تھی وہی میرے دل بیدار میں بھی ہے، دونوں کا ایک رنگ ہے۔

۷۔ اگر تم مجھے دیکھتے بھی نہیں ہو۔ تو میرا دھیان ضرور تمھیں رہتا ہے ورنہ خواب میں گھبرا کر چونک پڑنا کیسا؟

۸۔ "نالۂ زنجیر" سے خطاب ہے کہ اس کی گلی میں غل نہ کر کیونکہ یہاں ہر ایک کے پاؤں پہونچکر سو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "استفہام انکاری" ہے اس لئے اسی لہجہ سے پڑھئے۔

۹۔ دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہے:۔

خواب میں آکے کہتا ہے کہ مرے بن سوتے ہو؟

۱۰۔ میرے سوز دل کا یہ عالم ہے کہ اگر پانی میں پناہ لوں تو ہر ہر قطرہ گلخن کو بھی داغ رشک دے۔ یعنی گلخن بھی اپنی گرمی کو بھول جائے۔

۱۱۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے دست حنائی کا عکس پانی میں پڑے تو پنجۂ مرجاں بھی چنار کی طرح آگ دے اٹھے۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں ردیف بیکار معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بحالت خواب دست حنائی کا عکس افگن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں تن کا لفظ بھی کوئی خاص مفہوم پیدا نہیں کرتا۔

۱۲۔ سمندر، آگ کا کیڑا ہے، لیکن اگر میں اب دل سوزاں سے اسے تشبیہ دیدوں تو وہ بھی آگ سے گھبرا کر پانی میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھے۔

۱۳۔ میں چشم یار کی یاد میں دریا پر رویا تو آنسوؤں کی سوزش کی وجہ سے مردم آبی کی پلکیں بھی شمع کی طرح جلنے لگیں۔

۱۴۔ جب موت پر سکتہ کا شبہ ہوتا ہے تو چہرہ کے سامنے آئینہ رکھ کر دیکھتے ہیں، کیونکہ اگر ہلکی سی ہلکی سانس ہوگی تو بھی آئینہ پر اس کا دھندلا سا نشان پڑجائے گا۔ مومن کہتا ہے کہ یہاں تو جان ہی نہیں اور تم سکتہ کا شبہ کرکے آئینہ دکھاتے ہو۔ کیا اسی پر یہ بدگمان نہ ہونے کا دعوےٰ کرتے ہو۔

"شہوانیات" (مصنفہ نیاز فتحپوری) کا دوسرا اڈیشن
جو نظر ثانی کے بعد مقبول عام سایز پر نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔ قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

نقاب اُٹھ جانے کے بعد
نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہوگیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے قیمت ۸

مطبوعات موصولہ

دردانہ مجموعہ ہے آنسہ محمودہ رضویہ کے بعض ادبی مقالات کا جسے اس۔ جی کاردانی ام۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ آنسہ محمودہ کے یہ مقالات بعض رسایل میں شایع ہو چکے ہیں اور اپنے انداز تحریر سے اس دور کی یادگار ہیں جب ٹیگور کی تقلید ذوق عام کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

خیالات کی پاکیزگی اور بیان کی لطافت سے پتہ چلتا ہے کہ آنسہ محمودہ اس سے بہتر خدمت زبان کی انجام دے سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو کراچی۔

وحشر کنیر جناب ندیم اسوقت کے صاحب فکر نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور موجودہ دور کی شاعری میں جو جدید رجحانات نظر آتے ہیں، وہ انکے کلام میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر تاثیر کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے اور میں ان کے اس خیال کا موید ہوں کہ ندیم نے ان قطعات میں شاعری اور افسانہ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔۔۔ ان قطعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر کافی غایر ہے، لیکن اس میں فلسفیانہ خشکی یا واعظانہ یبوست نہیں، بلکہ ادبی لطافت ہے، ہلکے قسم کا رومان ہے، ایک خاص قسم کا دردمندانہ احساس ہے، جو پڑھنے والے کو کافی متاثر کرتا ہے۔

قطعات کا زیادہ حصہ سوگوارانہ کیفیت لئے ہوئے ہے، نقاشانہ رنگ کے قطعات بھی کافی ہیں، لیکن انقلابی رنگ کی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی۔ بہرحال مجموعہ بہت پر لطف ہے اور اس کا مطالعہ تھوڑی دیر کے لئے گردوپیش زمانہ سے ہمیں علیحدہ کر دیتا ہے۔ اُردو اکاڈیمی لاہور نے اسے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے قیمت ۴ روپے۔

شیخ و برہمن مجموعہ ہے جناب اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا۔ اعظم کریوی بہت مشاق افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کا مقامی رنگ، عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ، کردار اور زبان سب ایک ہی رجحان کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ رجحان زندگی کی طرف ان بانوں سے متعلق ہے جو بغیر کسی تمثیلی اُپج کے ہمیں روز متاثر کرتی رہتی ہیں۔

گاؤں اور گاؤں والوں کی فطرت و معاشرت سے متعلق جو واقعات افسانہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، انھیں کو اعظم صاحب نے لیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی اس بدنصیب آبادی کا بڑا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ دو روپیہ میں کتاب خانہ دانش محل امین آباد پارک سے ملسکتا ہے۔

شان خدا مولانا عبید الرحمان عاقل رحمانی کی تالیف ہے جس میں وجود خالق سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصود دہریوں اور ملحدوں کو راہ راست پر لانا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے ابھی تک سمجھا ہی نہیں سمجھا کہ اصل نزاع کیا ہے۔۔۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور مذاہب نے پیش کیا ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ عاقل صاحب اپنے استدلات میں جو زیادہ تر منقولی اور کمتر معقولی ہیں، کوئی نئی بات نہیں بتائی اور اسی مولویانہ کج بحثی اور کم نظری سے کام لیا ہے جو اس طبقہ کا قدیم شیوہ ہے۔۔۔ خدا سے انکار کرنے والوں کا جواب تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ لوگ جو مذہب کے بتائے ہوئے تصور خداوندی پر اعتراض کرتے ہیں، ان کا جواب دینا مشکل ہے، کیونکہ اس صورت میں حشر و نشر وغیرہ کا عقیدہ سب خاک میں ملجاتا ہے جس پر مذہب کی بنیاد قایم ہے۔ اس کتاب کی قیمت عہ رہے اور ملنے کا پتہ:۔ کتابستان پوسٹ بکس ۱۶۴ بمبئی۔

محمد رسول اللہ ترجمہ ہے ٹامس کارلایل کی مشہور تصنیف کا جس میں اسنے رسول اللہ کی حمایت کی ہے اور معترضین کا جواب دیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی مولانا عبید الرحمان صاحب عاقل رحمانی کا کیا ہوا ہے اور بُرا نہیں ہے۔ کارلایل نے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی ہے اسوقت سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی اور اسی لئے اسنے جو کچھ لکھا ہے وہ اسوقت کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اب جو اعتراضات خدا اور رسول کے مفہوم پر کئے جاتے ہیں انکی نوعیت بالکل علیحدہ ہے اسلئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اب اسکے ترجمہ سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ وہی۔

جواہر العلوم ترجمہ ہے علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب کا۔ ترجمہ مولوی عبد الرحیم صاحب پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے اور بُرا نہیں ہے۔ اس کتاب میں بصورت مکالمہ دنیا کے بعض قدیم و جدید عجائبات کو پیش کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب چیز کتاب کا وہ حصہ ہے جس میں قیامت اور جزا و سزا کے ثبوت پر عقلی دلایل پیش کئے گئے ہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس عقدہ کا کتاب کے موضوع سے کیا تعلق تھا۔ مغربی زبان کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے جواہر العلوم بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ کتابستان پوسٹ بکس ۱۶۴ بمبئی۔

راہگزر جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جناب عاشق حسین صاحب مشاق افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانے متوسط درجہ کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کو سامنے رکھکر لکھے گئے ہیں اور ان تمام الجھنوں، بے تابیوں اور نامرادیوں کے آئینہ دار ہیں، جن سے ہمیں اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ پلاٹ، زبان اور ادبیت سب کچھ ان میں موجود ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس رنگ کے افسانے لکھنے میں عاشق صاحب نے جو جگہ حاصل کر لی ہے وہ انکے لئے مخصوص ہے۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور